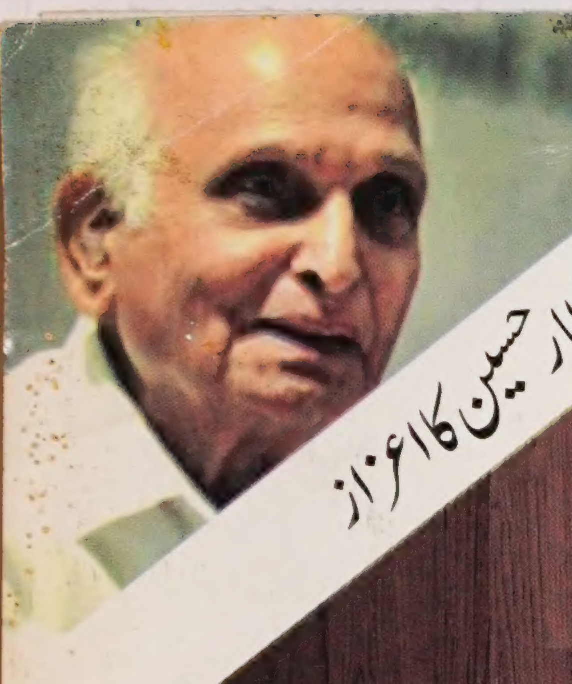


انتظار حسین کا اعزاز

ادارہ فروغ قومی زبان

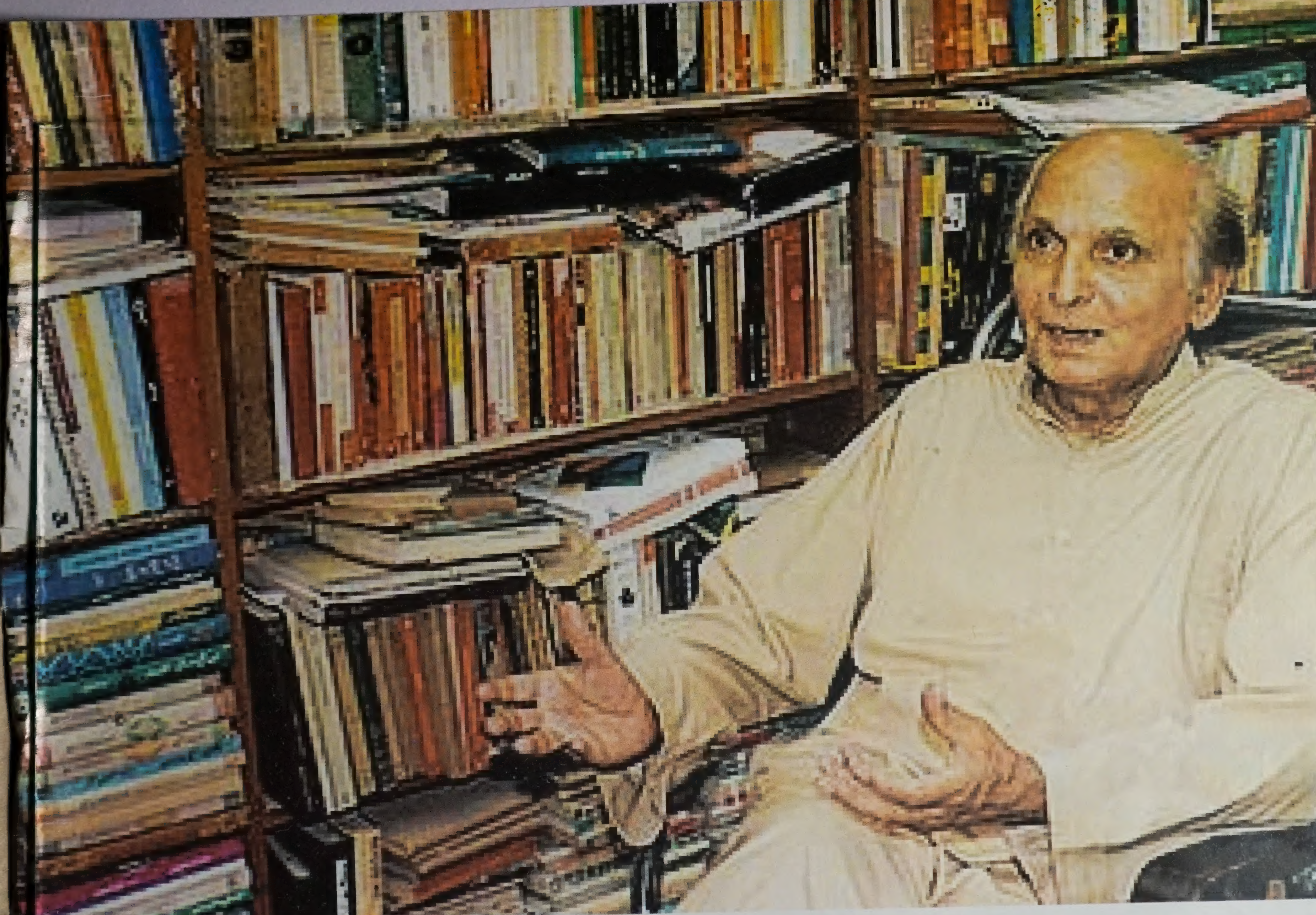
اخبارِ اردو

اسلام آباد

جون۔جولائی ۲۰۱۳ء



معمارانِ اردو ادب



انتظار حسین۔ پاکستان کی ادبی تاریخ کا ایک منفرد باب

انتظار حسین ایک عہد ہیں ایک تاریخ ہیں وہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں وہ بیک وقت ادیب بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، تنقید نگاری بھی کرتے ہیں اور کالم نگاری میں بھی وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ احمد عقیل روبی لکھتے ہیں ''انتظار حسین ۱۹۴۷ء میں اپنی بستی، ڈبائی بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تو سب کچھ وہیں رہنے دیا مگر ڈبائی کی مٹی یادداشت کی تھیلیوں میں بھر لائے۔ یہ تھیلیاں ان کے پاس محفوظ ہیں اور دل کے دالان میں جگہ جگہ رکھی ہیں۔ جیل روڈ لاہور کی بغل میں ان کا مکان موٹر ورکشاپوں میں گھرا ہوا ہے۔ جب ڈیزل، پٹرول اور موبل آئل بے ہنگم آواز کی تال پر رقص کرتے ہیں تو انتظار حسین یہ تھیلیاں کھول کر کوئل، طوطوں اور گالڑوں کے گیت سنتے ہیں، ڈبائی کے باغوں میں اٹھکیلیاں کرتی ہوا جب ان کے شانوں کو تھپتھپا کر لوری دینے لگتی ہے تو انتظار حسین اسپِ تخلیق پر سوار ہو کر کہیں قدر جنگل میں نکل جاتے ہیں واپسی اسی صورت ہوتی ہے جب ان کے شکاری تھیلے میں شکار پھڑ پھڑانے لگتا ہے، یہ سلسلہ جاری ہے۔ جنگل میں بکھرا آدمی تو نسخۂ ذات بھول کر جن کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھا مگر انتظار حسین اپنی مٹی سے جڑے راہِ حیات پر رواں ہیں، جو اپنی مٹی سے منہ پھیر لیں انہیں وہ آڑے ہاتھوں لیتے ہیں''۔



ادارہ فروغ قومی زبان

اخبارِ اردو

اسلام آباد

جلد:۳۱ شمارہ ۶۔۷ جون۔جولائی ۲۰۱۳ء

نگران اعلیٰ: عبدالحمید

ناشر: محمد بلال

مشاورت: پروفیسر فتح محمد ملک

مدیر اعلیٰ: سید سردار احمد پیرزادہ

مدیر معاون: تجمل شاہ

کمپوز کاری و تزئین: نوازش علی کلُّو

رنگین صفحات: رضوان عزیز کیانی۔انعام الحق

پروف خوانی: نور محمد خاور

مندرجات

ضروری اطلاع

☆ ماہنامہ اخبار اردو کا سالانہ چندہ اس وقت تک فی کس ۳۰۰ روپے ہے جو کہ فی کس رسالے کی اشاعت اور ترسیل وغیرہ پر خرچ ہونے والی اصل رقم سے بہت کم ہے۔ادارہ اپنے معزز قارئین کو ماہنامہ اخبار اردو تک زیادہ سے زیادہ رسائی دینے کے لیے اسے رعایتی نرخوں (سب سڈی) پر فراہم کرتا ہے۔

☆ ماہنامہ اخبار اردو کی ترسیل بذریعہ سرکاری ڈاکخانہ، بک پوسٹ کی جاتی ہے۔رسالے کو ڈاکخانے کے حوالے کرنے کے بعد اس کو متعلقہ پتے تک پہنچانا ڈاکخانے کی ذمہ داری ہے۔

☆ یہ بات علم میں آئی ہے کہ بعض اوقات متعلقہ پتا جات پر اخبار اردو نہ ملے تو وہاں کے ڈاکخانے سے پوچھ گچھ کی جائے تو آئندہ معاملہ حل ہو جاتا ہے۔البتہ جن معزز قارئین کو کبھی کبھار اخبار اردو نہیں ملتا انھیں ادارہ صرف اخلاقی طور پر رسالہ سٹاک میں دستیابی کی صورت میں دوبارہ ارسال کر دیتا ہے جو کہ قانونی ذمہ داری کے زمرے میں نہیں آتا۔

☆ اگر کوئی معزز قاری اخبار اردو کی ترسیلی فہرست میں اپنے نام و پتہ کی تصدیق کرنا چاہے تو وہ دفتری اوقات میں تشریف لا کر اطمینان کر سکتے ہیں۔تاہم معزز قارئین کے پتہ جات کی تبدیلی کی صورت میں ادارہ اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک تبدیلی کی باقاعدہ اطلاع معزز قاری کی طرف سے نہ آئے۔

امید ہے کہ مندرجہ بالا نکات اخبار اردو کے معزز قارئین کو رسالے کے حصول میں مدد فراہم کریں گے۔

فون: : ۹۲۵۰۳۱۱_۹۲۵۰۳۱۲،۹۲۵۰۳۱۳

فیکس : ۹۲۵۰۳۱۰

ای میل : akhbareurdu@gmail.com

ویب گاہ : www.nlpd.gov.pk

پتا : ادارۂ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان)، پطرس بخاری روڈ، ایچ ۸/۴، اسلام آباد (پاکستان)

شرح خریداری

سالانہ : ۳۰۰ روپے فی پرچہ : ۳۰ روپے

بیرون ممالک: ۵۰ امریکی ڈالر

(صرف بذریعہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر بنام مقتدرہ قومی زبان)

مضمون نگاروں کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

ناشر: ایگزیکٹو ڈائریکٹر (معتمد)، ادارۂ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان)، ایچ ۸/۴

اسلام آباد فون: ۹۲۵۰۳۰۹، فون: ڈائریکٹر جنرل (صدر نشین) ۹۲۵۰۳۰۸

طابع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد، فون: ۴۱۰۲۷۸۱

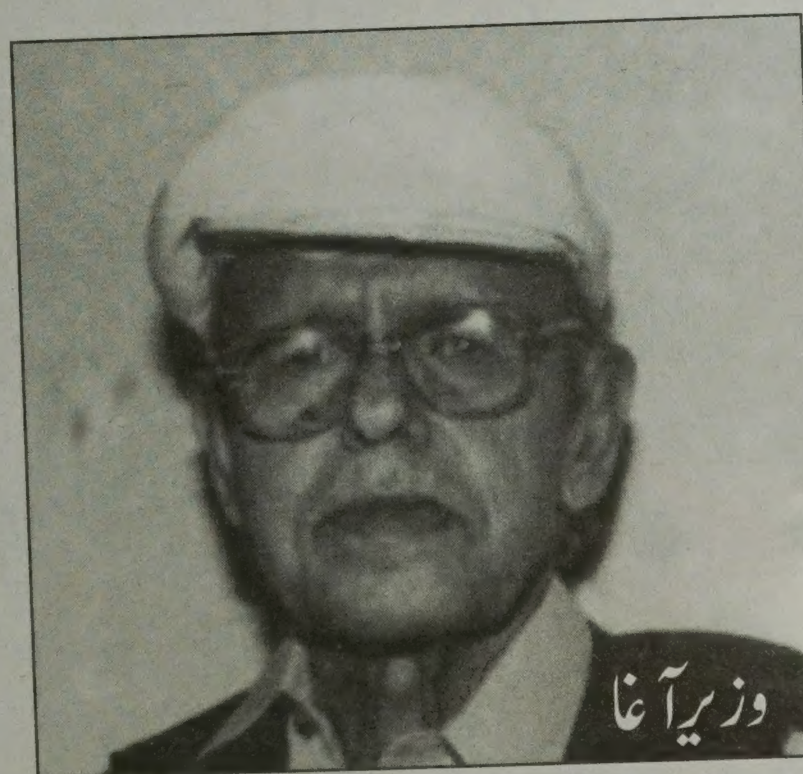
ڈاکٹر وزیر آغا

اردو اور انگریزی کے استعمال کی جائز حدود

محقق، نقاد اور معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا اب ہم میں نہیں رہے لیکن ان کا فن اور تحریریں آج بھی زندہ ہیں۔ اردو کے حق میں ان کی ایک تحریر پیش خدمت ہے۔

ہر زبان کا ایک لسانی تناظر ہوتا ہے جس پر دوسری زبانوں سے اخذ و اکتساب کی ساری داستان رقم ہوتی ہے۔ اردو زبان کے لسانی تناظر میں ہمیں فارسی، عربی، انگریزی اور پراکرتوں کے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہیں مگر یہ سب کچھ ایک فطری طریق سے سرانجام پایا ہے۔ نتیجتاً دوسری زبانوں کے الفاظ اردو زبان کی بنت میں شامل ہوئے ہیں اس کے دامن سے چمٹے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اس کے برعکس جدید ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کی شعوری سطح پر آمیزش ایک بالکل مصنوعی عمل ہے۔ جس سے ہندی زبان کی تازگی اور کوملتا بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اردو زبان کو سنسکرت کے الفاظ کی یلغار کا تو قطعاً کوئی خطرہ نہیں مگر یہاں ایک اور خطرہ ہے جو آج سے کافی عرصہ پہلے اردو زبان کے افق پر ایک شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوا تھا مگر جواب ایک جلا دینے والا سورج بن کر سوا نیزے پر آچکا ہے اور جس کی آتش بار شعاعوں نے اردو زبان کے حریری ملبوس میں جا بجا سوراخ کر دیے ہیں۔ میرا اشارہ انگریزی زبان کی طرف ہے جس نے ہمارے ملک میں سگی بہن کا کردار ادا کرنے کے بجائے سوتیلی ماں کا کردار ادا کیا ہے۔

ہر زبان ایک عمارت کی طرح ہوتی ہے جس میں چاروں طرف کھڑکیاں اور دروازے سورج کی روشنی اور ہوا کے لمس کو قبول یا رد کرنے کے لیے گاہے کھولے اور گاہے بند کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی وجہ سے زبان کی اس عمارت کی ساری کھڑکیاں اور دروازے مقفل کر دیے جائیں تو پھر نہ تو سورج کی روشنی ہی عمارت کے اندر جا سکتی ہے اور نہ وہاں تازہ ہوا ہی کا گزر ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جس عمارت کو روشنی اور ہوا سے محروم کر دیا جائے (چاہے یہ عمارت زبان کی، معاشرے کی ہو یا شخصیت کی) تو اس کے اندر سے بدبو کے بھبکے سے اٹھنے لگتے ہیں، نمی سی پھیل جاتی ہے اور دیمک کی کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ سنسکرت زبان کی عمارت کو جب برہمنوں نے پوری طرح مقفل کر دیا تو اس کے اعماق میں بھی یہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور پھر وہ زمانے کی روشنی اور ہوا سے محروم ہو کر انجماد کی نذر


وزیر آغا

ہوتی چلی گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اردو زبان کو کسی ایسی صورتحال کا سامنا نہیں اور اس نے ہمیشہ تازہ ہوا اور روشنی کے لیے اپنے دروازوں اور کھڑکیوں کو بار بار کھولا ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی دیکھیے کہ جس عمارت کی ساری کھڑکیاں اور دروازے مستقل طور پر کھول دیے جائیں تو اُس میں بادِ نسیم کے ساتھ ساتھ بادِ سموم بھی داخل ہو سکتی ہے اور سورج کی روشنی کے ساتھ جھلسا دینے والی دھوپ کی یلغار بھی بعید از امکان نہیں بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ جس عمارت کے دروازے اور کھڑکیاں ہمہ وقت کھلے ہوں وہ عمارت نہیں بلکہ ایک جلسہ گاہ ہے جس میں ہر طرح کی مخلوق آ جا سکتی ہے۔ کم از کم انگریزی کے معاملے میں مجھے یہ ہمیشہ محسوس ہوا کہ اردو زبان کی عمارت کی جملہ کھڑکیاں اور دروازے بڑی بے احتیاطی سے کھلے چھوڑ دیے ہیں جس کے نتیجے میں انگریزی کے الفاظ محاورے، نام اور ان سب سے وابستہ غیر ملکی تہذیبی مظاہر اور خباثتیں بے روک ٹوک ہماری تہذیب کے ایوانوں میں داخل ہوتی چلی گئی ہیں۔

مبادا کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے میں انگریزی کے معاملے میں پوری طرح قلعہ بند ہو جانے کے حق میں نہیں ہوں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ انگریزی زبان کی صورت میں ہمیں ایک ایسی کھڑکی میسر آئی ہے جس سے ہم پوری دنیا کی علمی اور سائنسی فتوحات کا نظارہ کر سکتے ہیں اور جس کے ذریعے علوم کی روشنی ہم تک پہنچ سکتی ہے بلکہ پہنچ رہی ہے۔ اس کھڑکی کو بند کر دینے کا مطلب ہو گا کہ ہم زمانے کے فیوض اور برکات سے خود کو محروم کر لیں گے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مغز کے ساتھ چھلکے کو بھی قبول کر لیا جائے۔ علوم کے ساتھ اُس تہذیبی کیپ سول کو بھی نگل لیا جائے جس میں یہ علوم بند کر کے بھیجے گئے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انگریزی کے الفاظ اور محاوروں اور ناموں کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ اردو کے الفاظ اور محاوروں کو دھکیل کر پرے کریں اور خود ان کی مسندوں پر قابض ہوتے چلے جائیں۔ بدقسمتی سے جہاں تک قومی زبان کی مملکت کا تعلق ہے اس میں دو حکمرانوں کا سکہ چل رہا ہے یعنی انگریزی اور اردو کا! اور آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ان کی حدود، حقوق اور اختیارات کیا ہیں۔

انگریزی کی عملداری ابھی تک جاری ہے اور بعض اوقات اس عملداری کے باعث اردو کی عملداری کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً عام زندگی بالخصوص کاروباری زندگی میں انگریزی اور اردو کے الفاظ کا دنگل جاری ہے حالانکہ اس دنگل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس خاص میدان میں اردو کی بالا دستی کا احساس دلایا جاتا۔ اس سلسلے میں ریڈیو، ٹیلی وژن اور دیگر ثقافتی ادارے معاشرتی رویوں کو ایک بڑی حد تک تبدیل کر سکتے ہیں۔ اسی

انگریزی زبان کو بے شک برقرار رکھیے بلکہ ضروری ہے کہ اُسے برقرار رکھا جائے اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے مگر ملک کے اندر عملداری اردو زبان ہی کی ہونی چاہیے

طرح عدالتوں، دفتروں، بنکوں اور دوسرے اداروں میں اردو زبان کو موئثر کردار ادا کرنے کی نہ صرف اجازت ملنی چاہیے بلکہ کوشش ہونی چاہیے کہ یہ زیادہ سے زیادہ موئثر کردار ادا کر سکے مثال کے طور پر اگر ملکی بنک ایک ضابطہ ساوضع کردیں کہ وہ غیر ملکیوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگوں کے صرف اردو دستخطوں ہی کو قبول کریں گے اور اسی طرح اوپر سے نیچے تک تمام سرکاری ملازمین کو یہ ہدایت کردی جائے کہ وہ اردو کے سوا اور کسی زبان میں دستخط نہیں کریں گے تو پورے ملک کی فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی آسکتی ہے کیونکہ جب دستخط اردو میں ہوں گے تو درخواستیں بھی اردو میں لکھی جائیں گی اور احکامات بھی اردو میں صادر کیے جائیں گے اور پوری کاروباری زندگی میں

> عدالتوں، دفتروں، بنکوں اور دوسرے اداروں میں اردو زبان کو موئثر کردار ادا کرنے کی نہ صرف اجازت ملنی چاہیے بلکہ کوشش ہونی چاہیے کہ یہ زیادہ سے زیادہ موئثر کردار ادا کر سکے

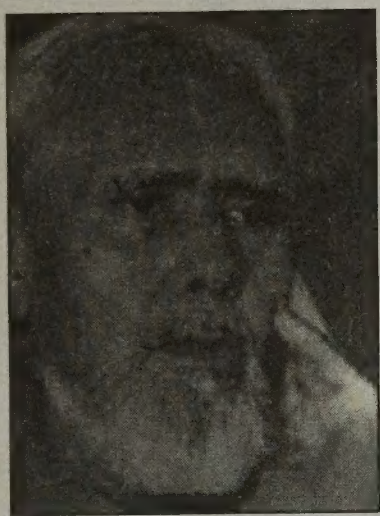
اردو کا نفوذ بڑھ جائے گا۔ ایسی صورت میں اس بات کی ضرورت پڑے گی کہ انگریزی زبان کے الفاظ اور اصطلاحات کے اردو تراجم کو عام کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلے میں پیش رفت ہو چکی ہے اور کئی ادارے اس ضمن میں کام کر رہے ہیں تاہم ابھی تک ترجمہ کرنے والے ان اداروں میں پوری ہم آہنگی پیدا نہیں ہوسکی۔ نتیجتاً ترجمے کے سلسلے میں مختلف رویے سامنے آئے ہیں۔ یہ بات اردو زبان کے فروغ کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے۔

آخر میں یہ گزارش کرکے اجازت چاہوں گا کہ انگریزی زبان کو بے شک برقرار رکھیے بلکہ ضروری ہے کہ اُسے برقرار رکھا جائے اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے مگر ملک کے اندر عملداری اردو زبان ہی کی ہونی چاہیے تاکہ انگریزی زبان کے حامیوں کو غیر مبہم الفاظ میں یہ معلوم ہوجائے کہ گھر کے اندر محترمہ کے اختیارات کی نوعیت کیا ہے نیز افرادِ خانہ کی قطار میں اُسے کس مقام پر کھڑے ہونے کا حق حاصل ہے۔

☆☆☆☆

معماران اردو ادب

قدرت اللہ شہاب



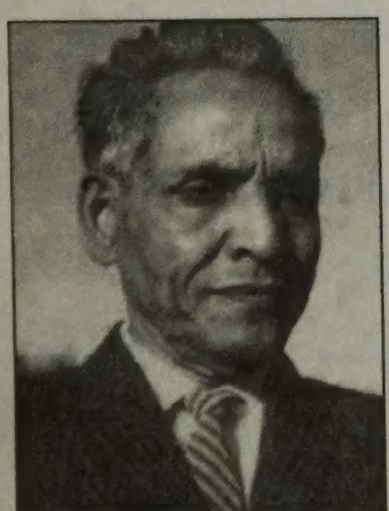
قدرت اللہ شہاب کا شمار ہمارے ملک کے نامور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کا زیادہ تر وقت سرکاری فرائض کی انجام دہی میں گزرا۔ ان کے اردو میں تخلیقی ادب کا معیار اتنا بلند ہے کہ انھیں تاریخ ادب میں مستقل مقام حاصل رہے گا۔ قارئین کے ساتھ شہاب کا بلاواسطہ تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ اس تعلق میں ان کے افسانوں، مضامین اور شخصی خوبیوں کو دخل رہا، تنقید و تحقیق کے سہارے کے بغیر ہی انھیں پڑھنے والوں نے عزت دی۔

اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں قدرت اللہ شہاب نے بہت کم افسانے لکھے مگر انھوں نے جو کچھ لکھا قارئین اسے بھلا نہ سکے۔ معروف ادبی رسائل اور اردو افسانوں کے انتخابوں میں ان کے افسانوں کو نمایاں جگہ ملی، مولانا صلاح الدین احمد ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اولین قدردان تھے۔ قدرت اللہ شہاب اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے افسانوں کو اتنے بلند پایہ پارکھوں نے اتنے پرجوش الفاظ میں سراہا۔ اردو افسانے کے ارتقاء پر تنقیدی، تحقیقی و تاریخی جائزوں میں مسلسل شہاب کا ذکر ملتا ہے۔

(پروفیسر فریدہ نذیر)

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی اردو افسانہ نگاری کا بڑا نام ہے۔



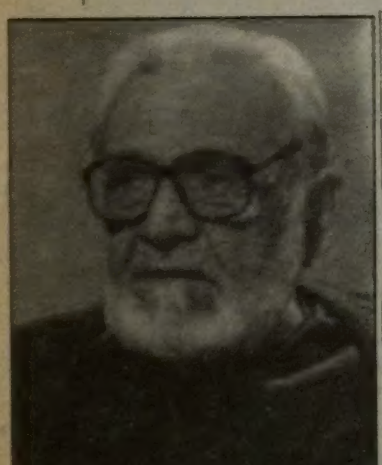
انھوں نے افسانہ، سوانحی ناول، سفرنامے، شخصی خاکے، ڈرامے اور رپورتاژ میں بیک وقت الگ الگ اسلوب اختیار کرتے ہوئے بالکل جداگانہ شناخت بنائی۔ ان کے اسلوب میں لسانی تجربوں کی رنگارنگی انھیں تمام معاصر لکھنے والوں میں ممتاز مقام پر فائز کرتی ہے۔ انھوں نے اردو، پنجابی روزمرہ کے افسانے تخلیق کیے، ناول لکھے، خاکے تحریر کیے مگر کہیں بھی ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیا بلکہ یوں لگتا ہے کہ ان کی تحریر اس کٹھالی سے گزر کر مزید بلیغ ہوتی چلی گئی۔

ممتاز مفتی کی تمام کتابیں اس بات کی گواہ ہیں کہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ کسی بھی مشکل اور ادق فلسفیانہ مسئلے پر جس سادگی اور بے تکلفی سے اظہارِ خیال کی قدرت رکھتے ہیں، معاصرین میں سے شاید ہی کسی اور کے ہاں نظر آئے۔ انسانی نفسیات کا جیسا گہرا مطالعہ وہ کر سکتے تھے، شاید ہی اردو ادب کا کوئی اور نثر نگار ایسی قدرت رکھتا ہو۔ یقیناً ان کی ادبی خدمات اردو ادب کے لیے گراں قدر ہیں۔

(ڈاکٹر نجیبہ عارف)

اشفاق احمد

اردو ادب کی تاریخ میں اشفاق احمد کا نام ہمیشہ



یاد رکھا جائے گا۔ اُن کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ دو سال تک روم یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے رہے۔ اس دوران انھوں نے اطالوی اور فرانسیسی زبانیں بھی سیکھیں۔ پھر نیویارک سے ریڈیائی نشریات کی تربیت حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں اپنا اشاعتی ادارہ ''داستان سرائے'' قائم کیا اور ساتھ ہی ساتھ ''داستان گو'' رسالے کا اجراء بھی کیا۔ ریڈیو نشریات میں تلقین شاہ ان کا مقبول پروگرام تھا، پاکستان ٹیلی وژن کے لیے متعدد ڈرامے تحریر کیے لیکن ''ایک محبت سو افسانے'' کا ڈرامہ سیریل زیادہ مشہور ہوا جس میں'' گڈریا'' افسانہ اردو ادب میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے ڈراموں میں ''من چلے کا سودا'' خاصا مشہور رہا۔ انھوں نے کئی درجن کتابوں کے ذریعے اردو ادب کے طالب علموں کے لیے گراں قدر علمی سرمایہ چھوڑا۔ جن میں نمایاں نام وداع جنگ، ایک ہی گولی، صبحان فسارے، طوطا کہانی، بندگلی، طلسم ہوش افزا اور ڈرامے، ننگے پاؤں، مہمان سرائے، بابا صاحبا، سفر در سفر، اُچے برج لاہور دے، ٹاہلی تھلے، حسرت تعمیر، جنگ بجنگ، سفر مینا، حیرت کدہ، شاہلا کوٹ، کھیل تماشا، گلدان، گھٹیا ٹیا، دھینگا مشتی، شورا شوری، ڈھنڈورا، عرض مصنف اور شہر آرزو جیسی بے شمار تخلیق کے مالک اشفاق احمد کی ذات میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں اور زاویے میں یوں کہانی کا رخ متعین کرتے کہ کہانی خود بولنے لگتی۔ ☆☆

ترجمہ وتحقیق: نبیلیٰ پیرزادہ

بھارت: زبانیں اور لسانی پالیسی

(الف) زبانوں کے مختلف خاندان
(Language Families)

بھارت بے پناہ لسانی تنوع کا خطہ ہے جس میں بولی جانے والی زبانیں اور سیکڑوں بولیاں اور لہجے زبانوں کے مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے ان میں سب سے بڑا ہند۔یورپی خاندان (Indo-Europian family) ہے۔ جس کی سب سے بڑی نمائندگی اس کی ہند۔آریائی (Indo-Aryan) شاخ (تقریباً ۷۰۰ ملین بولنے والے جو آبادی کا ۶۹٪ ہیں) اور کچھ نمائندگی فارسی، پرتگالی اور فرانسیسی جیسی اقلیتی زبانوں اور انگریزی بطور رابطہ کی زبان کے ذریعے ہوتی ہے جبکہ کشمیری اور دیگر داردک (Dardic) ہند۔ایرانی (Indo Iranian) اور مفروضۂ ہند آریائی زبانوں میں گفتگو کرنے والے تقریباً ۶ء۴ ملین افراد بھارت کی کل آبادی کا حصہ ہیں۔

ہند یورپی خاندان کا ارتقاء ''وسطی ہند آریائی پراکرت'' (Middle Indo-Aryan Prakrat) اور وسطی ادوار کی ''اپا بھرمسا'' (Apabhramsa) کی وساطت سے سنسکرت جیسی قدیم ہند۔آریائی زبان سے ہوا۔ اس بات پر اتفاق رائے موجود نہیں کہ ہندی۔اردو، بنگالی، میراٹھی، گجراتی، سرائیکی، پنجابی، آسامی، سندھی اور اوریائی جیسی شمالی ہند کی جدید زبانیں کس خاص وقت پر نمودار ہوئیں۔ تاہم ۱۰۰۰ء کو عام طور پر قبول عام حاصل ہے۔ ہر زبان پر مختلف اثرات وقوع پذیر ہوئے۔ مثال کے طور پر ہندی۔اردو (ہندوستانی) نے فارسی کا بے پناہ اثر قبول کیا۔

زبانوں کا دوسرا بڑا خاندان، دراوڑی خاندان (Dravidian family) ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد ۲۰۰ ملین سے زائد یا ۲۶٪ افراد پر مشتمل ہے جبکہ دیگر لسانی خاندانوں میں جن کے بولنے والوں کی تعداد نسبتاً کم ہے، آسٹرو۔ایشیائی (Astro-Asiatic) اور متعدد چھوٹی، تبتی۔ برمی (Tibeto-Burman) زبانیں شامل ہیں جو بالترتیب ۱۰ اور ۶ ملین بولنے والے افراد کا ذریعہ اظہار ہیں اور مجموعی آبادی کا ۵٪ حصہ ہیں۔

جنوبی ہند کی دراوڑی زبانوں کی، سنسکرت سے ہٹتے ہوئے اپنی ایک علیحدہ تاریخ تھی۔ ان بڑی دراوڑی زبانوں میں تامل، تلگو، کنڈا اور ملیالم شامل ہیں تاہم یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ملیالم اور تلگو زبان کے ۸۰٪ سے زائد الفاظ خالصتاً سنسکرت الفاظ ہیں اور تلگو رسم الخط (Script) متن کی اصل حالت کو ذرہ برابر متاثر یا تبدیل کیے بغیر سنسکرت کی تمام ترصوتیات (phonetics) کو ادا کرنے پر قادر ہے۔ شمالی ہند کی آسٹرو۔ایشیائی اور تبتی۔ برمی زبانیں بھی اسی طرح اپنی علیحدہ اور طویل تاریخ رکھتی ہیں۔

جنوبی انڈیمان جزائر (Andaman Islands) کی اونجی (Ongan) زبانیں ایک پانچویں لسانی گروہ کی تشکیل کرتی ہیں۔ ''انڈیمان کی عظیم زبانیں'' (Great Andamanese Languages) اب ناپید (extinct) ہو چکی ہیں ماسوائے ایک شدید خطرے سے دوچار، تیزی سے معدوم ہوئی زبان کے، جس کے بولنے والوں کی تعداد میں بھی روز بروز کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور معلوم ''تنہا زبان'' (Language Isolate) بھی ہے جو ''نہالی زبان'' کہلاتی ہے۔ شومپن (Shompen) زبانوں کی موجودگی کی نہ تو تصدیق ہو سکی ہے نہ ہی ان کی کوئی قسم بندی کی گئی ہے جبکہ سنتالی (Santali) سے لوگ مکمل طور پر ناواقف ہیں۔

> ۲۰۰۱ء کی سب سے حالیہ مردم شماری میں مادری زبان کی تعریف ایسی زبان کے طور پر کی گئی ہے جو کسی فرد کی ماں بچپن میں اس کے ساتھ گفتگو کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اگر ماں موجود نہ ہو تو شمار کنندہ کو اس زبان کا بطور ''مادری زبان'' اندراج کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں گھر کے بیشتر افراد گفتگو کرتے ہیں

بھارتی جمہوریہ کی زیادہ تر زبانیں براہمی سے اخذ شدہ رسم الخط جیسا کہ دیونا گری، بنگالی، اوریا، تامل، کانڈا وغیرہ میں لکھی جاتی ہیں تاہم اردو، عربی اور فارسی کے تبدیل شدہ رسم الخط (Perso-Arabic Script) میں تحریر کی جاتی ہے جبکہ سنتالی (Santali) اور چند دیگر چھوٹی چھوٹی زبانوں کا اپنا علیحدہ رسم الخط ہے۔

۱۹۶۱ء میں ہونے والی مردم شماری میں جمہوریہ بھارت میں ۱۶۵۲ زبانوں کی شناخت کی گئی (بشمول ان زبانوں کے جو برصغیر ہند کی مقامی نہیں)۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں ۱۵۷۶ قسم بند (Classified) زبانوں کی شناخت کی گئی ہے جبکہ بھارت میں دنیا بھر کی کل ۶۹۱۲ زندہ زبانوں میں سے ۴۱۵ زندہ زبانیں پائی جاتی ہیں۔ ۱۹۹۱ء کی اس مردم شماری کے مطابق ۲۲ زبانوں کے دس لاکھ (۱۰،۰۰،۰۰۰) سے زیادہ بولنے والے موجود تھے جبکہ ۵۰ زبانوں کے ایک لاکھ (۱۰۰،۰۰۰) سے زیادہ اور ۱۱۴ زبانوں کے بولنے والے دس ہزار (۱۰،۰۰۰) سے زائد مقامی افراد موجود تھے۔ ۲۰۰۱ء میں ہونے والی تازہ ترین مردم شماری کے مطابق ۲۹ زبانوں کے بولنے والے دس لاکھ (۱۰،۰۰،۰۰۰) سے زیادہ مقامی افراد ہیں، ۶۰ زبانوں کے ایک لاکھ (۱۰۰،۰۰۰) سے زیادہ جبکہ ۱۲۲ زبانوں کے بولنے والے دس ہزار سے زائد مقامی افراد پائے جاتے ہیں۔

(ب) بھارت کی لسانی پالیسی

بھارت جیسے وسیع وعریض اور کثیر لسانی خطے میں زبان سے متعلق پالیسی خصوصی توجہ کی طالب ہے۔ اس ضمن میں چند بنیادی اہمیت کے شعبوں مثلاً تعلیم، انتظام، عدالتیں، قانون سازی، ذرائع ابلاغ وغیرہ کے حوالے سے دیکھا جائے تو بھارت کی لسانی پالیسی میں اس لحاظ سے ہمہ جہتی ہے کہ یہ زبانوں کی نشوونما اور زبانوں کی بقا، دونوں پر مرکوز ہے اور اس بات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ زبانوں کے بڑے یا چھوٹے ہونے سے قطع نظر ہر زبان کے بولنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ اپنی مادری زبان کو اظہار کا وسیلہ بناتے ہوئے ہر شعبہ میں اس کا مؤثر استعمال کر سکیں۔ بھارت میں بڑھتے ہوئے سیاسی شعور کی بنا پر عوام میں اپنی مقامی زبانوں کے تحفظ اور بقا کا تصور بہت مضبوط ہے اور بھارت کی لسانی پالیسی اس ضمن میں بھرپور گنجائش فراہم کرتی ہے کہ ہر زبان کو آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔ درج ذیل ۶ نکات مذکورہ پالیسی کے عملی اطلاق کی وضاحت کرتے ہیں۔

ا۔ لسانی اجتماع (Language Clustering)

بھارتی آئین نے چودہ زبانوں آسامی (Assamese)، بنگالی (Bengali)، گجراتی (Gujrati)، ہندی (Hindi)، کانڈا (Kannada)، کشمیری (Kashmiri)، ملیالم (Malyalam)، میراٹھی (Marathi)، اوڑیا (Oriya)، پنجابی (Punjabi)، سنسکرت (Sanskrit)، تامل (Tamil)، تلگو (Telugo) اور اردو (Urdu) کو ۱۹۵۰ء میں اپنے آٹھویں شیڈول (Eighth Schedule) میں درج کیا۔ اُس وقت

دور حاضر میں بھارتی آئین کے مئی ۲۰۰۸ء کے آٹھویں شیڈول کے مطابق انگریزی کے علاوہ ۲۲ زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ بھارت کی لسانی پالیسی، زبانوں کی کثرت کی حفاظت اور بقا کی پالیسی ہے

سے اب تک اس فہرست کو تین بار وسعت دی جا چکی ہے۔ پہلی بار سندھی (Sindhi) کو شامل کرنے کے لیے، ایک اور مرتبہ کونکنی (Konkani)، مانی پوری (Manipuri) اور نیپالی (Nepali) شامل کرنے کے لیے اور تیسری بار سنتھالی (Santhali)، بودو (Bodo)، متھیلی (Maithili) اور ڈوگری (Dogri) شامل کرنے کے لیے۔ بھارتی آئین کی ایک ۱۰۰ ویں (100th) ترمیم جس کے ذریعے آٹھویں شیڈول میں مندرجہ بالا چار زبانوں سنتھالی، بودو، ڈوگری اور متھیلی کا اضافہ کیا گیا، کو تمام ۳۳۸ ممبران کی حمایت حاصل تھی۔ نیز ۳۳ مزید زبانوں کو شامل کیے جانے کا معاملہ زیر غور ہے۔ آٹھویں شیڈول کی یہ فہرست کسی طور حتمی نہیں اور مختلف زبانوں کے فوائد حاصل کرنے کے ایک مؤثر ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ ایک مرتبہ جب کوئی زبان اس فہرست میں شامل ہو جاتی ہے تو اس کا مقام فوری طور پر تبدیل ہو جاتا ہے اور اسے جدید بھارتی زبان (Modren Indian Language[MIL]) یا شیڈول زبان (Scheduled Language) کہہ کر پکارا جانے لگتا ہے۔ بھارتی آئین کا آٹھواں شیڈول زبان کی پالیسی کے حوالے سے سب سے اہم دستاویز ہے۔ جو ہزاروں لکھی اور نہ لکھی جانے والی زبانوں کا دو بڑے حصوں، شیڈول (Schedule) اور غیر شیڈول زبانوں (Non-scheduled language) کی صورت میں اجتماع کرتا ہے۔ گو تاریخی طور پر تو ان ہندوستانی زبانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں تاہم "آٹھویں شیڈول" میں شامل زبانوں کو غیر شیڈول زبانوں پر فوقیت دی جاتی ہے اور زبان کی نشوونما سے متعلق کسی بھی سرگرمی کے لیے انھیں پہلے زیر غور لایا جاتا ہے اور زبان کے حوالے سے تمام تر سہولیات خاص طور پر ٹیکنالوجی کو زبان میں ضم کرنے کے حوالے سے حکومت کے حوصلہ افزا اقدامات (Technology Development in Indian Languages [TDIL]) بھی فی الحال انہی زبانوں تک محدود ہیں۔

ایک دوسری قسم کا اجتماع (Clustering) مادری زبان کی سطح پر زبانوں کے بننے سے عمل میں آتا ہے۔ اگرچہ کہ مردم شماری کا دفتر (Census Office) ۱۱۴ زبانوں کی شناخت کرتا ہے تاہم ان میں سے بہت سی صرف ایک انفرادی زبان نہیں بلکہ بالترتیب بہت سی مادری زبانوں اور بولیوں کا مجموعہ ہیں۔ زبان کے مختلف گروہوں کی تشکیل اس وقت ہوتی ہے جب بہت سی مختلف مادری زبانیں بولنے والے اُس ایک چھت کے نیچے جمع ہوتے ہیں جسے "زبان" کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "ہندی" جسے ایک زبان کہا جاتا ہے: ۴۵ سے زیادہ "مادری زبانوں کا اجتماع (cluster) ہے۔ جس میں بھوج پوری (Bhojpuri)، مگدھی (Magadhi)، متھیلی (Maithili)، مارواڑی (Marwari)، راجستھانی (Rajisthani)، صدری (Sadri) وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ مادری زبان کا نظریہ (Notion of Mother Tongue)

مادری زبان (Mother Tongue) کے نظریے کو بھارتی آئین میں بہت اہمیت حاصل ہے جیسا کہ ذریعہ تعلیم سے متعلق فیصلوں اور سرکاری زبانوں جیسے بہت سے امور سے متعلق حکومتی پالیسی کا دارومدار اس نظریہ کی توضیح پر ہے۔ اس ضمن میں وہ سب سے پہلا سوال جو کسی بھی کثیر لسانی معاشرے میں زبان کی پالیسی کے حوالے سے ذہن میں آتا ہے، یہ ہے کہ وہ کون سے عناصر ہیں جنھیں کسی بھی جگہ کے شہریوں کی مادری زبان کی تشکیل کرنی چاہیے۔ خود مختار بھارت میں تعلیمی مقاصد کے لیے اس سوال کا سب سے پہلا جواب "صوبائی وزرائے تعلیم کی قرارداد (۱۹۴۹)" (Provincial Education Ministers Resolution) اور مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم (Central Advisory Board of Education) کے توثیق شدہ بیان میں دیا گیا جس کے مطابق "مادری زبان وہ زبان ہوگی جسے ماں باپ یا پرورش کرنے والا (Guardian) مادری زبان قرار دے"۔

۲۰۰۱ء کی سب سے حالیہ مردم شماری میں مادری زبان کی تعریف ایسی زبان کے طور پر کی گئی ہے جو کسی فرد کی ماں بچپن میں اس کے ساتھ گفتگو کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اگر ماں موجود نہ ہو تو شمار کنندہ کو اس زبان کا بطور "مادری زبان" اندراج کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں گھر کے بیشتر افراد گفتگو کرتے ہیں۔ بہت چھوٹے بچوں یا گونگے، بہرے اور معذور افراد یا بچوں کی صورت میں اُس زبان کو ہی مادری زبان سمجھا جائے گا جس میں متعلقہ شخص یا بچے کی ماں گفتگو کرتی ہے۔ مذکورہ مردم شماری میں اس امر کو تسلیم کرنے کی گنجائش بھی موجود ہے کہ مختلف لسانی (Ethnic) پس منظر سے تعلق رکھنے کے باعث ایک ہی خاندان کے افراد کی مختلف مادری زبانیں بھی ہو سکتی ہیں۔ بھارت کی عدلیہ نے بھی بحث و تمحیص کے بعد مادری زبان کے حوالے سے متعدد احکامات جاری کیے ہیں۔ اس ضمن میں مدراس کی ہائی کورٹ کے ۲۰۰۰ء کے صادر کیے گئے فیصلے[1] میں کہا گیا کہ "ان مقدمات کے حوالے سے کسی بچے کی مادری زبان، اسی زبان کو سمجھا جانا چاہیے جس سے وہ سب سے زیادہ روشناس ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مادری زبان، ماں کی زبان یا باپ کی زبان ہو۔ عام طور پر والدین اس بات کا اندازہ قائم کرنے کے لیے موزوں ترین افراد ہیں کہ وہ کون سی زبان ہے جس سے بچہ سب سے زیادہ شناسا ہے"۔

بھارت میں مختلف ریاستوں اور ملک کی مجموعی کثیر لسانی صورت (Multilingual nature) کے سبب عدلیہ نے ثانوی مادری زبان (Second Mother tougue) کے نظریہ کو بھی متعارف کروایا ہے اور اس ضمن میں احکامات جاری کیے ہیں۔ مثال کے طور پر کرناٹک (Karnataka) کی ہائی کورٹ نے ذریعہ تعلیم کے لیے زبان اختیار کرنے کے حوالے سے "کانڈا" (Kannada) زبان کو ٹولو (Tulu) اور (Kodagu) مادری زبانیں بولنے والوں کے لیے "ثانوی مادری زبان قرار دیا ہے جیسا کہ وہ کرناٹک میں مقامی کا درجہ رکھتے ہیں۔

۳۔ انتظام (Administration)

ہر قوم تاریخی طور پر نشوونما کے ایک ارتقائی عمل سے گزرتی ہے۔ انتظام کی زبان کو بھی ان مراحل سے استثنیٰ حاصل نہیں۔ چنانچہ ان زبانوں کے بارے جاننا ضروری ہوتا ہے جنھیں کسی ملک کے حکمرانوں نے اپنے خطے کے انتظام کے لیے استعمال کیا۔ بھارت کے بہت سے حکمرانوں نے ایسے علاقوں پر حکومت کی جہاں ان کی رعایا ایک سے زیادہ زبانیں بولتی تھی بلکہ اکثر اوقات تو بادشاہ کی زبان ان تمام زبانوں سے مختلف ہوتی تھی جنھیں اس کی رعایا بول چال کے لیے استعمال کرتی تھی۔ تاہم تاریخی طور پر یہ بھی درست ہے کہ رعایا کی زبان یا زبانوں اور اس زبان کے مابین ہمیشہ مطابقت رہی ہے جس کے ذریعے ان پر حکومت کی جاتی تھی۔ اگرچہ کہ ایسی صورت بارہا دیکھنے کو ملتی ہے جب صرف ایک زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا تاہم ایسا بہت کم ہوا کہ ایک زبان تمام تر حکومتی نظم ونسق کے لیے رابطے کی زبان ہو۔ سرکاری زبان کا زیادہ استعمال قوانین وضع کرنے اور حکومتی نظام کا دیگر اندرونی سرگرمیوں تک

---

[1] مدراس ہائی کورٹ کے فیصلہ کا اصل انگریزی متن:
1."....mother tongue of a child should only be understood for the purpose of these cases as the language which the child is most familiar with..... mother tongue need not be the mother's tongue or the father's tongue. Generally the parents are the proper persons who can acess and say as to which is the language that the child is most familiar with"

محدود تھا تاہم عملی اقدامات کے حوالے سے عوام سے رابطے کے لیے متعلقہ مقامی زبانوں کو ہی فوقیت دی جاتی تھی چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرکاری زبان اور سرکاری انتظام کو چلانے کے لیے استعمال کی جانے والی زبانوں میں فرق پایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اگرچہ آندھرا پردیش کا ۱۹۶۶ء کا سرکاری زبان کا قانون (Official Langauge Act 1966) متعلقہ علاقے میں تلگو (Telugu) کو سرکاری زبان تسلیم کرتا ہے تاہم مخصوص علاقوں اور خاص حالات میں انتظامی سرگرمیوں کو چلانے کے لیے انگریزی، اردو، تامل، کانڈا اور اوریا کے استعمال کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ چنانچہ آندھرا پردیش میں انتظامی مقاصد کے لیے مذکورہ زبانیں استعمال کی جاتی ہیں گو تلگو یہاں کی واحد سرکاری زبان ہے۔ بھارت کی لسانی پالیسی بولنے والوں کی سہولت اور مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی بھی مخصوص ریاست میں اسی طرز پر کثیر لسانی کی حوصلہ افزائی اور احترام کرتی ہے۔ تاہم بھارت کے آئین کے آٹھویں شیڈول کے مطابق اس وقت ۲۲ زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔

۴۔ تعلیم (Education)

بھارت کے آئین کی رو سے ۱۴ سال تک کے بچوں کے لیے تعلیم مفت اور لازمی ہے البتہ آئین میں اس حوالے سے کوئی صراحت موجود نہیں کہ کن زبانوں کی تعلیم دی جائے گی اور وہ کون سی زبانیں ہوں گی جنھیں درس و تدریس میں بطور ذریعہ تعلیم اختیار کیا جائے گا۔ تاہم اس امر میں یہ حکمت عملی بھی پوشیدہ ہوسکتی ہے کہ بھارت جیسے کثیر لسانی ملک میں صرف چند زبانوں کا ممتاز کیا جانا بھارت کی آزاد جمہوری حیثیت کو متنازعہ بنانے کا باعث نہ بنے۔

آل انڈیا کونسل برائے تعلیم (All India Council for Education) نے ۱۹۵۶ء میں تعلیم کے حوالے سے "سہ لسانی فارمولے (Three Language Formula [TLF])" کو اپنانے کی تجویز دی۔ اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی میں یہ سہ لسانی فارمولا شامل کرنے کی سفارش کی گئی جس میں تین زبانوں کی تدریس شامل ہے۔ ہندی بولنے والی ریاستوں میں ہندی کے علاوہ کوئی سی جدید انڈین زبان یا ماڈرن انڈین لینگویج (MIL) جس میں جنوبی ہند کی زبانوں کو فوقیت دی جائے گی۔ علاوہ ازیں ہندی اور انگریزی کی تعلیم دی جائے گی۔ ان ریاستوں میں جہاں ہندی مقامی زبان نہیں ہے وہاں ہندی، انگریزی اور متعلقہ علاقائی زبان کی تدریس کی جائے گی۔

یکم جنوری ۲۰۰۰ء میں جاری کی گئی ایک دستاویز بعنوان The National Curriculum Framework for School Education: A Discussion Document میں سہ لسانی فارمولے (TLF) کا جائزہ لیتے ہوئے درج ہے:

"بہت سی ریاستوں، اداروں اور بورڈ میں اس فارمولا کا اصل روح کے مطابق اطلاق نہیں کیا گیا اور لوگوں کی مادری زبان کو اولین زبان (First Language) کے رتبے سے محروم رکھا گیا ہے...... چونکہ بدلتے ہوئے معاشرتی۔ اقتصادی تناظر (Socio-Economic Scenario) میں دوسری (ثانوی) اور تیسری زبان کا فاصلہ سمٹ گیا ہے۔ چنانچہ تمام مقاصد اور مواقع کے استعمال کے لیے حقیقتاً دو ثانوی زبانیں ہوسکتی ہیں۔ بعض ریاستیں صرف ایک ذولسانی فارمولا (Two Language Formula) پر عمل کرتی ہیں جبکہ بعض میں "جدید انڈین زبان" کی جگہ سنسکرت اور عربی جیسی کلاسیکی زبانیں پڑھائی جارہی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض بورڈوں اور اداروں میں ہندی کی بجائے فرانسیسی اور جرمن جیسی یورپی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت بھی ہے۔ اس پس منظر میں سہ لسانی فارمولا کا وجود صرف ہماری نصابی دستاویزات اور دیگر پالیسی اعلانات تک ہی محدود ہے......"

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جاچکا ہے مندرجہ بالا دستاویز کے مطابق سہ لسانی فارمولا میں درج ذیل تین زبانیں شامل ہیں: (i) گھریلو زبان/ علاقائی زبان۔ (ii) انگریزی زبان (iii) ہندی بول چال نہ رکھنے والی ریاستوں میں ہندی زبان اور ہندی بول چال والی ریاستوں میں کوئی سی جدید انڈین زبان۔

مادری زبان اور دیگر مختلف زبانوں میں تعلیم کے میدان میں مندرجہ بالا تمام امکانات کے حوالے سے چھٹے "آل انڈیا ایجوکیشن سروے" کی رو سے سکول کی سطح پر پڑھائی جانے والی ۴۱ زبانوں کی شناخت کی گئی ہے جن میں سے ۱۹ کو مختلف سطحوں پر بطور ذریعہ تعلیم استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم جوں جوں طلباء تعلیم کے اعلیٰ مدارج میں پہنچتے ہیں، مطالعے کے لیے دستیاب اور ذریعہ تعلیم، دونوں حوالوں سے زبانوں کی تعداد میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور تکنیکی اور انتظامی تعلیم کے لیے صرف انگریزی ہی بطور ذریعہ تعلیم استعمال کی جاتی ہے۔

سکول میں پڑھائی جانے والی اور ذریعہ تعلیم کی زبانیں
(School Languages and Medium of Instruction)

Angami		Limboo	
Ao		Lotha	
Arabic	عربی	Malayalam	ملیالم
Assamese	آسامی	Manipuri	مانی پوری
Bengali	بنگالی	Marathi	میراٹھی
Bhutia		Maithili	متھیلی
Bodo	بودو	Mizo	
Dogri	ڈوگری	Nepali	نیپالی
English	انگریزی	Nicobaree	
French	فرانسیسی	Oriya	اوڑیا
Garo		Persian	فارسی
Gujarati	گجراتی	Portuguese	پرتگالی
Hindi	ہندی	Punjabi	پنجابی
Kakhbarak		Sanskrit	سنسکرت
Kannada	کانڈا	Sema	
Kashmiri	کشمیری	Tamil	تامل
Khasi		Telugu	تلگو
Konkani	کونکنی	Tibetan	تبتی
Konyak		Urdu	اردو
Laddakhi	لداخی	Zeliang	
Lepcha			

۵۔ مطبوعہ صحافت (Print Media)

پرنٹ میڈیا کے حوالے سے زبان کے متعلق تشکیل دی جانے والی پالیسی کا دارومدار اس امر پر ہے کہ ایک مخصوص خطے یا علاقے کے لوگ کس زبان میں خبریں اور دیگر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بھارت میں کسی بھی زبان، بولی یا رسم الخط میں اخبار جاری کرنے پر پابندی نہیں ہے۔ بھارت میں مطبوعہ صحافت کا آغاز ۱۷۸۰ء میں ہوا جس کے بعد سے اب تک اس میں ایک تواتر کے ساتھ بے پناہ ترقی ہوئی ہے۔ ۲۰۰۲ء میں کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق بھارت میں ۱۰۱ مختلف زبانوں اور بولیوں میں اخبار اور رسائل شائع کیے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

Ahirani	اہیرانی	Lakhar-Mara	
Anal	اَنال	Latin	لاطینی
Angami Naga		Lushai	
Angika	اَنگا	Magahi	مگہی
Anglo	اینگلو	Maithili	متھیلی
Arabic	عربی	Malayalam	ملیالم
Assamese	آسامی	Manipuri	مانی پوری
Banjara	بنجارا	Marathi	میراٹھی
Bangali	بنگالی	Marwari	مارواڑی
Bhojpuri	بھوج پوری	Meetelion	
Biate		Mikir	
Bihari	بہاری	Mising	
Bilingual	ذولسانی	Mizo Lushai	
Bishnupriya	بشنوپیریا	Multi Lingual	کثیر لسانی
Bodo	بودو	Muridari	
Burmese	برمی	Nagaa	ناگا
Chakma	چکما	Nepali	نیپالی
Chhatisgarghi	چھاتس گرگی	Nicobari	نکوباری
Chinese	چینی	Oriya	اوڑیا
Dogri	ڈوگری	Pahari	پہاڑی
English	انگریزی	Pali	پالی
Esperanto	اسپرانتو	Persian	فارسی
Finish	فینی	Piate	
French	فرانسیسی	Piate-Pau	
Ganje		Pitalri	
Garhwali		Portuguese	پرتگالی
Garo	گارو	Punjabi	پنجابی
Gaundi		Pushto	پشتو
German	جرمن	Rajasthani	راجستھانی
Goani		Rongamei	
Gorkhali Nepali	گورکھالی نیپالی	Russian	روسی
Greek	یونانی	Sanskrit	سنسکرت
Gujarathi	گجراتی	Santhali	سنتھالی
Halbi	حلبی	Saurashtra	سوراشٹر (انڈونیشی)
Haruti		Simite	

Haryanvi	ہریانوی	Sindhi	سندھی
Himachali	ہماچلی	Sinhali	سنہالی
Hindi	ہندی	Sirayaki	سرائیکی
Hindustani-Persian	فارسی۔ ہندوستانی	Spanish	ہسپانوی
Hmar		Swahili	سواہلی
Indonesia	انڈونیشی	Syryn	
Italian	اطالوی	Tamil	تامل
Jaintal		Telugu	تلگو
Kabur		Thadou-Kuki	
Kanarese	کنتری	Thandon	
Kannada	کانڈا	Thankhul Naga	
Kashmiri	کشمیری	Tibetan	تبتی
Khasi		Tiddinchin	
Koch- Rajbanshi		Tripuri	
Kodava		Tulu	تولو
Kokborok		Urdu	اردو
Konkani	کونکنی	Vaiphei	
Koshli-Oriya		Yugaslavia	یوگوسلاوی
Kuki	کوکی	Zemi Naga	
Kumauni		Zokan	
Kurbi			

جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں، بہت سی غیر ملکی زبانیں بھی اس فہرست کا حصہ ہیں تاہم کسی بھی زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد کے اعتبار سے ہندی سرفہرست ہے، جس میں ۲۵۰۷، اردو میں ۵۳۴، انگریزی میں ۴۰۷، میراٹھی میں ۳۹۵، تامل میں ۳۹۵، کانڈا میں ۳۶۴، ملیالم میں ۲۲۵، تلگو میں ۱۸۰، گجراتی میں ۱۵۹، پنجابی میں ۱۰۷ اور بنگالی میں ۱۰۳ اخبار شائع ہوتے ہیں۔

۶۔سرکاری زبانیں (Official Langauges)

بھارتی جمہوریہ کی سرکاری زبانیں معیاری ہندی (Standard Hindi) اور انگریزی ہیں۔ بھارتی آئین کے آرٹیکل (۱) ۳۴۳ کے مطابق[۱] ''متحدہ بھارت کی سرکاری زبان دیوناگری رسم الخط میں ہندی ہوگی''۔ ریاستوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے، انفرادی طور پر اپنی اپنی سرکاری زبانیں مقرر کرلیں۔ مثال کے طور پر مہاراشٹر (Maharashtra) میں میراٹھی (Marathi) واحد سرکاری زبان ہے، آندھرا پردیش میں ''تلگو'' (Telugu) واحد سرکاری زبان ہے اور کرناٹک (Karnataka) کی ریاست میں ''کانڈا'' (Kannada) واحد سرکاری زبان ہے جبکہ ریاست جموں کشمیر میں ''کشمیری'' (Kashmiri) ''اردو'' (Urdu) اور ''ڈوگری'' (Dogri) سرکاری زبانیں ہیں۔ بھارتی آئین کا آرٹیکل (۱) ۳۴۳ اس بات کی گنجائش فراہم کرتا ہے کہ کسی مخصوص ریاست میں ضروری قانون سازی کے بعد معیاری ہندی یا کسی دیگر زبان کی بطور سرکاری زبان شناخت ہو سکے۔ ۱۹۶۷ء میں آئین کی ۲۱ ویں ترمیم سے پہلے بھارت میں ۱۴ سرکاری علاقائی زبانوں (Official Regional Languages) کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ آئین کے آٹھویں شیڈول اور ۷۱ ویں ترمیم کے ذریعے ان میں ''سندھی'' (Sindhi)، کونکنی (Konkani)، ''مانی پوری'' (Manipuri) اور ''نیپالی'' (Nepali) کا اضافہ کیا گیا جس کے نتیجے میں سرکاری علاقائی زبانوں کی تعداد بڑھ کر ۱۸ ہوگئی۔ اگرچہ ''سرکاری زبان'' کا درجہ پانے والی زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ تاہم اب بھی چند ایسی زبانیں ہیں جن کے بولنے والوں کی کثیر تعداد کے باوجود انھیں یہ رتبہ نہیں مل سکا۔ ان میں سب سے بڑی ''بھیلی'' (Bhili) زبان ہے جس کے تقریباً ۹ء۶ ملین بولنے والے موجود ہیں۔ اس کے بعد گونڈی (Gondi) کا درجہ آتا ہے (اٹھارہویں نمبر پر) جو تقریباً ۲ء۷ ملین لوگوں کی زبان ہے۔ تاہم اس کے برعکس دو ایسی زبانیں بھی ہیں جو محض سیاسی وجوہ کی بنا پر آٹھویں شیڈول میں شامل کی گئی ہیں لیکن جن کے بولنے والے مقامی افراد کی تعداد ۲ ملین سے بھی کم ہے۔ ان زبانوں میں مانی پوری (Manipuri) جس کے ۱ء۵ ملین بولنے والے ہیں (۲۵ ویں نمبر پر) اور بوڈو (Bodo) جس کے ۱ء۴ ملین بولنے والے ہیں (۲۶ ویں نمبر پر) سرفہرست ہیں۔ ثقافتی اور تاریخی وجوہ کی بنا پر سنسکرت بھی سرکاری شیڈول پر موجود ہے گو صرف ۱۴ ہزار لوگ اسے اپنی زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تاہم سکولوں اور کالجوں میں طالب علموں کی ایک کثیر تعداد ایک کلاسیکی زبان کے طور پر اس کو پڑھتی اور سیکھتی ہے۔

دور حاضر میں بھارتی آئین کے مئی ۲۰۰۸ء کے آٹھویں شیڈول کے مطابق انگریزی کے علاوہ ۲۲ زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ بھارت کی لسانی پالیسی، زبانوں کی کثرت کی حفاظت اور بقا کی پالیسی ہے۔ یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق ''اگرچہ کہ دنیا کے طول وعرض پر بولی جانے والی اندازاً ۶۰۰۰ زبانوں میں سے تقریباً نصف اس وقت معدوم ہو رہی ہیں یا معدوم ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں۔ تاہم یہ بات قابل ستائش ہے کہ اس تناظر میں بھی حکومت کی کامیاب اور درست پالیسیوں کی بنا پر بھارت نے اپنے اس بے پناہ لسانی تنوع کو قائم اور محفوظ رکھا ہے''۔

حوالہ جات:

1. Wikipedia
2. Comrie, Bernard. (Edited), The World's Major Languages, 1987, Croom Helm Ltd, London & Sydney.
3. Crystal, David. The Cambridge Encylopedia of Language., 1988, Cambridge University press, Cambridge, New York Melborne & Sydney.

۱۔ آئین (۱) ۳۴۳ کا اصل انگریزی متن:
The Official Language of the Union shall be Hindi in Devanagari Script.

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض

شیر محمد، ابنِ انشا

(سالگرہ کے حوالے سے خاص مضمون)

آبائی ماحول، خاندانی حالات، وطن، پیدائش اور نام ونسب بڑے سکہ بند قسم کے عنوان ہیں جن کو موضوع بنائے بغیر کسی اہم ادبی شخصیت کی سوانح حیات کے بیان میں وہ متانت اور سنجیدگی پیدا نہیں ہوتی جو ایک علمی اور تحقیقی کام کے لیے ضروری ہے لیکن بات صرف متانت یا سنجیدگی کی نہیں۔ دراصل یہ جاننا کہ کوئی کسی بھی حوالے سے اہم شخصیت فی الحقیقت کیا ہے آسان کام نہیں۔ انسان کے بیرونی خدوخال کے علاوہ اس کی ایک داخلی کائنات بھی ہوتی ہے جس کی تشکیل میں ہم اس کے توارث، بچپن کے حالات، ابتدائی تعلیم اور اس کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی پس منظر کو نظر انداز نہیں کر سکتے بلکہ اس کے خاندان اور آب وجد کا ذکر بھی اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کی ذہنی نشوونما کے تجزیے اور اس کی شخصیت کی باز آفرینی کی کوشش میں ان عوامل سے دوچار ہوئے بغیر چارہ نہیں! یہ الگ بات کہ جب وہ شخصیت اس سارے ماحول سے ابھر کر ہمارے سامنے آئے تو اس طویل مسافت کی گرد تک ہمیں اس کے چہرے پر تو کیا اس کے پاؤں پر بھی نظر نہ آئے۔ یہ بات ابنِ انشا کے سلسلے میں خاص طور پر قابل التفات ہے کہ کس طرح دورِ جدید کی متمدن شہری فضاؤں سے دور ایک معمولی بستی کے غریب کاشتکار گھرانے کا بچہ اپنی ذاتی لیاقت اور کوشش سے شعر گوئی میں میرؔ اور نظیرؔ کی روایت کا امین اور اردو نثر میں شگفتہ نگاری کے ایک لازوال اسلوب کا مالک بنا۔ ابن انشا ۱۵ جون ۱۹۲۷ء کو جالندھر کی تحصیل پھلو کے گاؤں تھلہ آباد میں پیدا ہوئے۔ جو اپنے گاؤں سے ورنیکلر مڈل کا امتحان دینے قریب قصبہ کے سکول میں آیا تو عام کھدر کی چارخانہ دار رنگ دار دھوتی باندھے ہوئے پاؤں سے ننگا ایک سہما ہوا جھجکتا کانپتا لڑکا تھا لیکن جب اس نے لندن کے ایک ہسپتال میں قریباً پچاس اکاون سال کی عمر میں ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کیں تو کرۂ ارض کے قریباً سبھی قابل دید نگر اور معروف بستیاں گھوم چکا تھا اور اردو میں شگفتہ نگاری کے ایک ایسے انداز کی داغ بیل ڈال گیا جو اسی سے خاص تھا اور اپنے تراجم، سیاحت ناموں، طنزومزاح کے مجموعوں، خطوط اور فکاہیہ کالموں کی بدولت ادبیات اُردو کا ایک وقیع اور معتبر نام قرار پایا۔ دنیاوی قدر ومنزلت کے لحاظ سے بھی اس کا عہدہ وزیر کے برابر تھا جسے اپنی ابتدائی زندگی میں ہندی اور گورمکھی کی ایک آدھ معمولی کتاب کے سوا کوئی ڈھنگ کی چیز پڑھنے کو نہ ملی، لیکن جس نے مملکت پاکستان میں کتابوں کی ترقی اور فروغ کے لیے بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ کتابوں کی دنیا کے مسائل معلوم کر کے ان کے حل کے لیے موثر اقدامات تجویز کیے اور کئی منصوبوں اور ترقیاتی سکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، جو متعدد کتاب میلوں، کتابی نمائشوں اور تعارفی تقریبات کا روح رواں تھا۔ جو بیرون ملک پاکستانی مطبوعات کا نہایت کامیاب نمائندہ اور یونیسکو کے مطالعاتی پروگراموں کا سرگرم کارکن تھا اور ملک کے قریباً سبھی قابل ذکر روزناموں ہفت روزوں اور ماہناموں کے ذریعے اپنی تمام


ابن انشا

مصروفیات سے عوام الناس کو اور اپنے خاص طنزومزاح سے بھرپور انداز میں ادبی قارئین کو مطلع رکھتا تھا۔ جس نے بے تحاشا لکھا اور بہت خوب لکھا اور اپنے معاصر لکھنے والوں سے اپنا لوہا منوایا...... لوگ اس کے اس بہروپ پر عش عش کر اٹھے لیکن جو اپنی شاعری ہی کو اپنا اصلی روپ اور ویرانئ دل کی حکایتیں سنانے اور جوگ بجوگ کی کہانیاں کہنے ہی کو اپنا فن جانتا تھا بقول خود:

انشاؔ جی ہے نام انہی کا، چاہو تو ان سے ملوائیں؟
ان کی روح دہکتا لاوا، ہم تو ان کے پاس نہ جائیں!
یہ جو لوگ بنوں میں پھرتے، جوگی بے راگی کہلائیں
ان کے ہاتھ ادب سے چومیں، ان کے آگے سیس نوائیں!
سیدھے من کو آن دبوچیں، میٹھی باتیں سندر بول
میرؔ، نظیرؔ، کبیرؔ اور انشاؔ ...... سارا ایک گھرانا

ابن انشا کے ہمدم دیرینہ ممتاز مفتی نے ایک دفعہ ایک منصوبہ بنایا تھا کہ مشہور ادیبوں کو خودنوشت آپ بیتیاں پیش کی جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ابنِ انشا کو لکھا کہ اپنی آپ بیتی لکھیں۔ جواب میں انھوں نے ممتاز مفتی کو جو مکتوب لکھا، اس میں انھوں نے کہا:

"تم نے جو کچھ مانگا ہے اس کی نوعیت معلوم نہیں ہوئی۔ اگر تھرڈ پرسن میں چاہیے تو میں کیوں لکھوں۔ تم خود کیوں نہ لکھو لیکن نہیں میاں، تمہارا کچھ اعتبار نہیں۔ جانے کیا لکھ دو۔ لہٰذا اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہے، چند سطریں لکھتا ہوں، انھیں گھٹا بڑھا لو"۔

"مشرقی پنجاب کے دوآبے کا دہقانی کہیں بھی پہنچ جائے۔ لاہور کہ دہلی، لندن کہ کیلیفورنیا۔ اپنی ادا سے فوراً پہچانا جاتا ہے۔ یہ لوگ لکھتے بھی ہیں تو وارث شاہ کے استاد کے بقول مونج کی رسی میں موتی پروتے ہیں لیکن ابن انشا کو موتی چنداں نہیں بھاتے۔ اپنی مونج کی رسی میں وہ کاٹھ کے منکے پروتا ہے۔ اس کا محاورہ اور لہجہ دہلی، لکھنؤ ہر جگہ کی سکہ بندی سے دور ہے اور سچ پوچھو تو یہی ایک سلیقے کی بات اس نے کی ہے ورنہ ادب کے بازار میں جس کی تعریف پوچھو...... اپنے کو فلاں ابن فلاں اور موتیوں کا خاندانی سوداگر بتاتا ہے۔ ابن انشا کو بارہا اللہ کا شکر ادا کرتے دیکھا گیا ہے کہ اس کے خاندان میں کوئی صاحب دیوان یا بے دیوان شاعر نہیں ہوا۔ ورنہ یا تو اسے اس کے نام کا سہارا لینا پڑتا یا اس کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑتا۔ سید انشاء اللہ خاں انشاؔ سے بھی اس کی کوئی نسبت نہیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہے اور خطوں میں اسے سید ابن انشا تک لکھتے ہیں اور یہ چاہتا تو اس نسبت سے سید بن سکتا تھا لیکن یہ عزت سادات بھی اسے کبھی مرغوب نہیں ہوئی۔ اپنی دہقانیت میں خوش ہے اور اللہ اسے اسی میں خوش رکھے"۔

"پڑھائی کو دیکھیے تو اس نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے۔ تجربے کو دیکھیے تو اس نے بہت پاپڑ بیلے ہیں اور ایران توران بلکہ فرنگستان تک گھوما ہے۔ مطالعے میں اردو، انگریزی اور پنجابی سے باہر فارسی اور ہندی سے بھی شغف ہے۔ نظم نثر سبھی میں قلم آزمائی کی ہے لیکن اپنے لیے باعث عزت صرف شاعری کو سمجھتا ہے۔ شاعری جس میں جوگی کا فقر، طنطنہ، وارفتگی اور آزادگی ہے۔ بات چیت کیجیے تو بعض اوقات بقراطیت بھی چھانٹے گا، لیکن اصل میں

بقراطوں سے نفور ہے۔ فقط انشا جی ہے"۔

"......بچوں کے لیے بھی شاعری کی ہے، لیکن ایسی نظمیں تو بچے بھی لکھ سکتے ہیں یا شاید، بچے ہی لکھ سکتے ہیں۔ نثر لکھنے کا انداز شگفتہ ہے۔ جسے مزاح لطیف بھی کہتے ہیں لیکن اس ذیل میں کم لکھتا ہے حالانکہ اس کا میدان یہی ہوتا تو خوب ہوتا"۔

"خاموش ہے، عزلت گزیں ہے، بھلکڑ ہے.......... عشق بھی کرتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میاں قیس کے انتقال کے ساتھ یہ قوم ناپید ہوگئی تھی وہ اس سے ملیں۔ یہ ہماری نہیں اس کی اپنی فرمائش ہے:

انشا سے ملو اس سے نہ روکیں گے ولیکن
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی!
مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا سودا
باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی!"

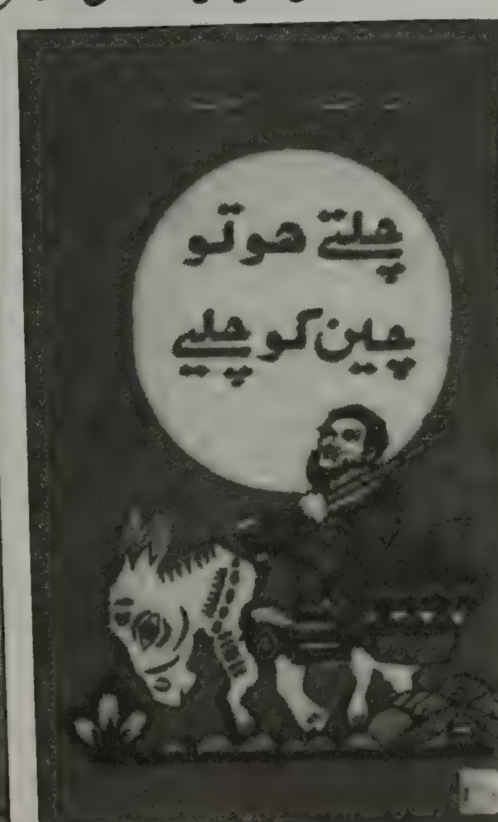
بھارت کے صوبہ پنجاب کے شہر لدھیانہ سے چودہ کلو میٹر یعنی قریباً پونے نو میل کے فاصلے پر پھلور کا جنکشن واقع ہے۔ لدھیانہ سے اس قربت کے باوجود یہ قصبہ کچھ انتظامی مصلحتوں کے پیش نظر ضلع جالندھر میں شامل تھا اور اس کی ایک تحصیل شمار ہوتا تھا، حالانکہ جالندھر شہر اس قصبے سے سنتالیس کلومیٹر دور تھا۔ گویا لدھیانہ سے قریباً تین گنا فاصلے پر۔ اس لیے انتظامی معاملات سے قطع نظر پھلور کی آبادی کا زیادہ رابطہ اپنے اصل ضلعی صدر مقام جالندھر کی بجائے لدھیانہ سے رہتا تھا۔ چنانچہ اس علاقے کے سکولوں کے طلبا بھی آٹھویں درجے کے بعد مزید تعلیم کے لیے جالندھر کی بجائے لدھیانہ کا رُخ کرتے تھے۔ کاروباری لوگوں کو بھی خرید فروخت کے لیے لدھیانہ ہی نزدیک پڑتا تھا کیونکہ اپنا ضلع بجا، لیکن یہ شہر ان کے لیے ایک تہائی سے بھی کم دوری پر تھا اور شہری ترقی اور خوشحالی میں بھی کسی طرح جالندھر سے کم نہیں تھا۔

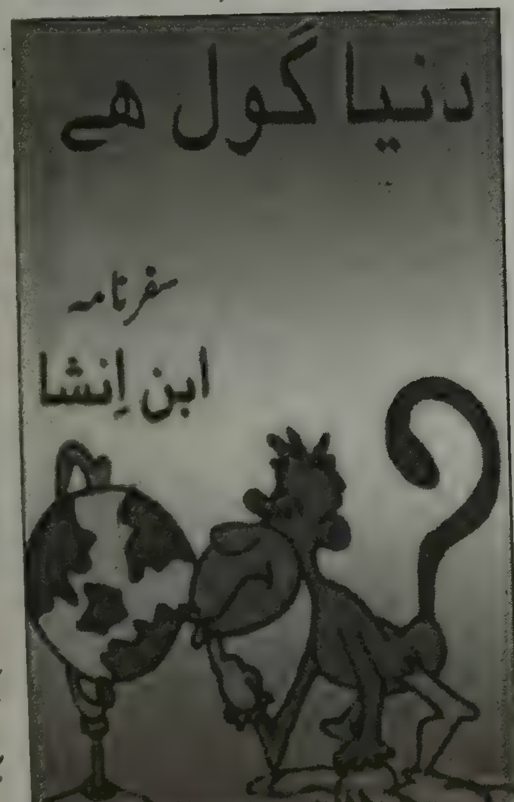
تحصیل پھلور سے اڑھائی تین میل کے فاصلے پر ایک سرسبز شاداب اور پُر رونق گاؤں تھلہ آباد تھا جس کی زیادہ آبادی سکھ کاشتکاروں پر مشتمل تھی۔ یہی لوگ نسبتاً خوش حال بھی تھے۔ یہاں دو تین گھر ہندو بنیوں کے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی برائے نام تھی اور اس میں نمایاں برادری کھوکھر راجپوتوں کے ایک خاندان کی تھی جن کے پاس سکھوں کے مقابلہ میں بہت کم زمین تھی۔ ان کے آبا و اجداد بھکر، ملتان اور سندھ وغیرہ سے نقل مکانی کر کے تلاش روزگار میں ان علاقوں میں آ نکلے تھے اور تین چار پشت پہلے انھوں نے دین اسلام قبول کیا تھا۔ اس ظاہری مذہبی فرق کے باوجود اس گاؤں کی عمومی فضا بہت پُر امن تھی کیونکہ مسلمانوں کے ایک دو خاندان تھے۔ ہندو بھی نہ ہونے کے برابر اور سکھ......ان کا تو خیر یہ گاؤں تھا۔

اس گاؤں کے وسط میں تین کمروں اور دو برآمدوں پر مشتمل ایک لوئر مڈل سکول تھا جس میں چھٹی جماعت تک تعلیم دی جاتی تھی لیکن انگریزی کے مضمون کے بغیر۔ اساتذہ میں اہم نام ماسٹر چین سنگھ اور لالہ رام پرشاد کے تھے۔ پھر ورنیکلر مڈل کے لیے ایک قریبی نسبتاً بڑے گاؤں اپرہ کا رخ کرنا پڑتا تھا لیکن انگریزی اس مڈل سکول میں بھی نہیں تھی۔ درس و تدریس کی حد تک زیادہ تر ہندو اور سکھ ہی ان تعلیمی اداروں سے استفادہ کرتے تھے۔ ابن انشا اس گاؤں 'تھلہ' کے اس پرائمری سکول کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک ڈائری میں رقمطراز ہیں:

"میرے بزرگ ایران یا توران سے نہیں آئے۔ ہفت ہزاری بھی نہیں تھے۔ مغلوں سے کوئی قبالہ یا انگریزوں سے کوئی جاگیر بھی نہیں پائی۔ گھرانے میں کوئی کسی فن کا جید عالم نہیں گزرا۔ اساتذہ بھی ماسٹر چین سنگھ اور لالہ رام پرشاد قسم کے تھے۔ درس گاہیں بھی معمولی پائیں"۔

اس بستی کی مسلمان کھوکھر برادری میں ایک نام





چوہدری ہیرے خاں نسبتاً زیادہ معروف تھا۔ ان صاحب کے پاس کاشتکاروں کے لیے گاؤں سے منسلک ہی رقبے میں تھوڑی لیکن کافی زرخیز زمین تو موجود تھی اور اگر وہ محنت اور جانفشانی سے کام لیتے تو بہت اچھی گزر بسر ہو سکتی تھی لیکن ان کے مزاج میں اپنے متمول ہونے کی نمائش کا جذبہ بہت زیادہ اور سفید پوشی کا عنصر غالب تھا۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ کے قائل اور میلوں ٹھیلوں میں شرکت کے رسیا تھے اور تھوڑے کو بھی زیادہ بتا کر ہم چشموں میں ممتاز رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ ادھار لے کر بھی اپنی امارات کے اظہار کا موقعہ نہ جانے دینا جن کی سرشت میں شامل تھا تا کہ خاندان کی ناک نیچی نہ ہونے پائے۔ بس ان کی چودراہٹ یہیں تک تھی۔ طبعاً شریف النفس اور لڑائی جھگڑے سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ اس زمانے کے دیہاتی چوہدریوں کے مشاغل ازقسم کتوں اور مرغوں وغیرہ کی لڑائیوں سے بھی انھیں کوئی شغف نہ تھا۔ عام حالات میں ان کی بڑی عیاشی، یہی تھی کہ حقہ درمیان میں ہو۔ چار آدمی بیٹھے ہوں اور گپ لگ رہی ہو جس میں نمایاں آواز انہی کی ہو۔

ان کی پہلی اولاد ایک بیٹی تھی جو چھوٹی عمر میں چل بسی۔ پھر دو بیٹے پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ لبھو خاں اور منشی خاں۔ لبھو خاں منشی خاں سے دس بارہ سال بڑے تھے اور اپنے والد کے صحیح جانشین۔ صرف ایک بات میں باپ سے مختلف کہ ان کے مزاج میں نفاست پسندی، صلح جوئی اور نرمی تھی۔ یہ درشت مزاج اور غصیلے تھے۔ بڑے کھڑکے دڑکے کے قائل۔ اپنے خود ساختہ نظریات کے پابند۔ لڑکیاں تو در کنار لڑکوں کی تعلیم کے بھی سخت خلاف، صرف قوت جسمانی کے قائل اور عزت و آبرو کے روایتی خاندانی تصورات پر جان دینے پر ہمہ وقت مستعد بلکہ کسی بے حد معمولی بات پر بھی لڑائی مار کٹائی کو تیار۔

مرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں!

کی تصویر مجسم! اور دشمنی کی بنیاد معمولی ہنسی مذاق بھی ہو سکتا تھا۔ اگرچہ وہ ہر وقت لیے دیئے اور سنجیدہ رہتے تھے۔ ان کا یہ خوف (فسادِ خلق) برادری میں تو جو تھا سو تھا، گھر کی چار دیواری کے اندر بھی چڑی نہیں پھڑک سکتی تھی۔ ان کے گھر میں داخل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ عورتیں اپنے سرانی چادروں سے ڈھانپ لیں (شفوں یا شفون قسم کے ٹرانسپیرنٹ دوپٹوں کا رواج ابھی ان دیہات تک نہیں پہنچا تھا اور نہ اس کی یہاں گنجائش تھی۔ اکثر بھائیوں کی طرح چھوٹے بھائی منشی خاں کا مزاج بڑے بھائی کے بالکل برعکس تھا بلکہ والد کی زندگی میں ان کی حوصلہ افزائی سے انھوں نے اپنے گاؤں سے لوئر مڈل سکول میں چار جماعتیں بھی پڑھ لی تھیں۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ وہ تعلیم حاصل کریں لیکن باپ کے انتقال کے بعد بڑے بھائی نے ان کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ بلکہ ممتاز مفتی راوی ہیں کہ سکول سے نکل کر جب بھائی کے ساتھ کاشتکاری میں ہاتھ بٹانا شروع کیا تو اس خاندان کی گزر بسر بڑی مشکل سے ہوتی تھی اور غم غلط کرنے کے لیے انھوں نے پنجابی میں شعر کہنے کا مشغلہ بھی اختیار کیا۔

"منشی خاں ایک معمولی کسان تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ اس دلخراش حقیقت کو بھولنے کے لیے اس نے پنجابی میں شعر کہنے کا شغل اپنا رکھا تھا۔ اچھے شعر کہتا تھا۔ خوش گلو تھا"۔

بہر حال منشی خاں ان لوگوں میں تھے جن کے شب و روز میں کوئی لمبے چوڑے اتار چڑھاؤ نہیں ہوتے۔ نہ انھیں زندگی سے بہت زیادہ امیدیں ہوتی ہیں۔ روکھی سوکھی کھا کر

اللہ کا شکر ادا کرنے والے لوگ!

منشی خاں کی شادی اپنی برادری ہی میں لدھیانہ کی تحصیل سمرالہ کے کاشتکار خاندان میں چوہدری فضل خاں کی صاحبزادی مریم سے ہوئی۔ یہ لوگ بھی انھی کی طرح اپنے ہاتھوں سے کھیتی باڑی کرتے تھے اور سخت کوش قسم کے محنتی کسان تھے۔ منشی خاں کی بیوی مریم ایک مکمل گرہستن خاتون ثابت ہوئیں۔ جس طرح کی ہماری محنت کش دیہاتی عورتیں ہوتی ہیں۔

مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر کی تحصیل پھلو کا متذکرہ بالا سرسبز و شاداب گاؤں تھلہ ابن انشا کا وطن اور یہ صابر و شاکر میاں بیوی، منشی خاں اور مریم ان کے والدین تھے۔

ابن انشا اپنے کثیر العیال والدین کی ازدواجی زندگی کا پہلا ثمر تھے۔ پہلوٹھی کی اولاد۔ ماں باپ نے اپنے پہلے بیٹے کا نام شیر محمد رکھا۔ شیر محمد کے بعد ان کے ہاں سردار محمد اور ریاض محمد نے جنم لیا۔ چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ جن کے موجودہ نام بالترتیب عصمت آراء، نادرہ خاتون، حمیدہ بانو اور بلقیس ہیں۔

اپنی پیدائش کی قطعی تاریخ خود ابن انشا کو بھی معلوم نہیں۔ اپنی خود نوشت ڈائری میں انھوں نے اپنے وطن، نام اور تاریخ پیدائش کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

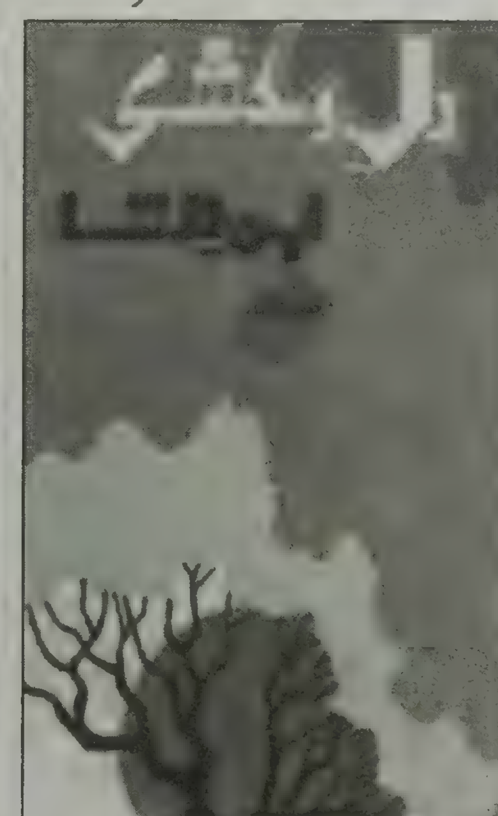
''پیدائش ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے ایک دیہاتی کاشتکار گھرانے میں ہوئی۔ اس گھرانے میں تعلیم نہیں تھی۔ فقط والد صاحب نے چوتھی جماعت تک پڑھا تھا۔ پیدائشی نام شیر محمد ہے جو راجپوت ہونے کی نسبت سے شیر محمد خاں ہوگیا۔ پیدائش کی قطعی تاریخ معلوم نہیں۔ دیسی تاریخوں کا جو حساب معلوم ہوا اس سے ہاڑ کی سنکرانت یعنی اساڑھ مہینے کی پہلی تاریخ کا دن۔ ۱۵جون ۱۹۲۷ء معلوم ہوتا ہے''۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں ان کی تاریخ پیدائش ۴جنوری ۱۹۲۴ء درج ہے۔

سردار محمود نے اس کی جو وجہ بتائی وہ بھی قابل توجہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس زمانے میں غریب دیہاتی گھرانوں میں تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ خصوصاً مسلمان نوجوانوں میں تو اس کا تناسب بہت ہی کم تھا اور اگر کوئی تعلیم حاصل کرتا بھی تھا تو اس کا منتہائے مقصود میٹرک کا امتحان ہوتا تھا۔ جس کے بعد معمولی کلرکی کا حصول، سکول کی ملازمت یا محکمہ مال کے پٹواری بن جانا بہت خوش قسمتی خیال کیا جاتا تھا۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لیے عمر کی کم از کم پابندی اٹھارہ سال تھی۔ اس سے کم عمر دسویں پاس امیدوار کو اس عمر تک پہنچنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ جو ظاہر ہے خوشگوار انتظار نہیں تھا۔ چنانچہ حفظ ما تقدم کے طور پر سمجھ دار والدین اور بعض اوقات پہلی جماعت کے محتاط داخلہ انچارج اساتذہ خود ہی بچے کی عمر آٹھ نو سال لکھ لیتے تھے تاکہ میٹرک کرنے کے ساتھ ہی سرکاری نوکری کی مطلوبہ حد تک پہنچ جائیں۔ یہی صورت حال ابن انشا کے معاملے میں پیش آئی اور پہلی جماعت میں جب ان کی عمر پانچ ساڑھے پانچ سال ہوگئی، انھیں آٹھ سال سے زائد کا ظاہر کیا گیا۔

دوران گفتگو ان کے چھوٹے بھائی سردار محمود نے راقم الحروف کو یہ بھی بتایا کہ:

''بھائی جان اکثر تأسف کا اظہار کیا کرتے تھے کہ زندگی میں دو چیزوں نے مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ ایک میٹرک کے امتحان میں لکھی ہوئی میری زیادہ عمر اور دوسرے اوائل عمر کی میری شادی نے''۔





انتظار حسین کے نام ۲۵مئی ۱۹۵۳ء کے تحریر ایک خط میں یوں رقمطراز ہیں:

''......میں نے مدت ہوئی چیزوں کا تجزیہ کرنا چھوڑ دیا ہے اور اب بڑے مزے سے گزرتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہمی، اوہام پرست، خبطی، سنکی، آزادہ رو، وارستہ مزاج...... میں ہمیشہ سے تھا لیکن لاہور میں رہ کے کمانا کھانا اور کھلانا پڑا تو دل پر عقل کا مارشل لا لگا دیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ عمر عزیز کے بہترین سال ہر گئے۔ اگلی جون یعنی اگلے ماہ میں ستائیس سال کا ہو جاؤں گا۔ بہت گزر گئی۔ اب تھوڑی رہ گئی ہے۔ داڑھی میں بھی چاندی سا سفید بال نظر آ گیا ہے۔ اب تو وہ وقت ہے کہ راج پاٹ نئی نسل کو سونپ کر باقی عمر یاد الٰہی میں صرف کروں''

بچے کی عمر ابھی بمشکل پانچ ساڑھے پانچ سال ہو گی کہ خود محروم لیکن تعلیم کے شائق باپ چوہدری منشی خاں نے اپنے بڑے بھائی ملک لبھو خاں کھوکھر کی بھرپور مخالفت کے باوجود ایک خوشگوار صبح گاؤں کے ہندو بنیے کی دکان سے سیر بھر بتاشے بطور شیرینی ساتھ لیے اور اپنے شیر محمد کی انگلی پکڑ کر اسے تیسری گلی کی نکڑ پر واقع پرائمری سکول کی پہلی جماعت میں جا بٹھایا۔ سردار محمود راوی ہیں کہ بھائی شیر محمد اپنے سب بہن بھائیوں اور ہم مکتبوں میں حیرت انگیز حد تک حساس تھے۔ چپ چاپ، خاموش، بچپن کے معصوم کھیلوں وغیرہ سے بھی نفور۔ ایسے بچوں میں سے ایک جن کی خواہش ہوتی ہے کہ سب انھیں اچھا کہیں۔ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا وہ خوف زدگی کی حد تک احترام کرتے تھے۔ بہت سریع الحس ہونے کی وجہ سے وہ استادوں سے ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کی کوشش کے علاوہ کسی دوسرے بچے کو بھی پٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے سکول کا کام نہ کیا ہو۔ اگرچہ گھر کا ماحول تعلیم کے لیے قطعاً سازگار نہیں تھا۔ اس مشترکہ خاندانی نظام میں صرف ان کے والد بچے کو پڑھنے کے لیے ہر ممکن سہولت مہیا کرتے تھے۔ لیکن گھر کے بعض معمول کے کاموں سے پھر بھی مفر نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی مصروفیتوں کے علاوہ گھر میں رکھی ہوئی چند بکریوں کو گاؤں سے باہر اٹھالی گئی فصل کے کھیتوں میں چرانا ابن انشا نے اپنے ذمہ لے لیا تھا لیکن اس سے ان کے تعلیمی انہماک میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔

بقول ممتاز مفتی:

''شیر محمد کو بچپن میں بکریاں چرانا پڑیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے امکانات بہت کم تھے۔ البتہ شوق باپ سے ورثے میں پایا تھا''۔

ممتاز مفتی کی یہ بات، بہت حد تک قابلِ اعتنا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ منشی خاں کو جب سکول کی چوتھی جماعت سے اٹھا لیا گیا تو وہ اپنی جماعت کا سب سے اچھا طالب علم تھا لیکن اسے تعلیمی دنیا سے نکال کر بڑے بھائی نے اپنے ساتھ کھیتی باڑی کے معمولات میں شامل کر لیا تھا چنانچہ کمی وہ اپنے بیٹے میں پوری کر رہا تھا۔

چوہدری منشی خاں کے پوتے یعنی ابن انشا کے پہلے صاحبزادے چوہدری عبدالستار نے ایک ملاقات کے دوران راقم الحروف کو بتایا کہ ہمارے دادا باوجودیکہ نیم خواندہ تھے لیکن انھیں پنجابی کے بہت سے اشعار یاد تھے۔ بالخصوص ہیر وارث شاہ، سیف الملوک اور بابا فرید کے کلام میں سے انھیں کئی کئی بند یاد تھے۔ جنھیں وہ خاص خاص موقعوں پر بے تکلف دوستوں کی محفل میں سنایا بھی کرتے تھے بلکہ وہ خود بھی پنجابی میں کلام موزوں کرتے تھے لیکن صرف خود محظوظ ہوتے یا دو چار۔ قریبی دوستوں کو سنانے کی حد تک وہ اکثر اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے کہ باوجود شوق کے انھیں تعلیم سے محروم کر دیا گیا۔ اسی لیے جب

ان کے اپنے بیٹے کی تعلیم کا سوال آیا تو اگرچہ وہ حلیم الطبع اور نرم خو آدمی تھے لیکن انھوں نے اس کی مخالفت میں کسی کی نہ سنی اور گاؤں کے رسم ورواج کے برخلاف بہت چھوٹے سے شیر محمد کو سکول بھیجنا شروع کر دیا۔ نہ صرف اسے سکول میں داخل کرایا بلکہ سکول کے اساتذہ سے بھی راہ ورسم بڑھائے اور اپنے بچے کی بتدریج تعلیمی ترقی کا جائزہ لینے اکثر سکول جایا کرتے اور ان کی ذات میں جو علمی کمی رہ گئی تھی اسے وہ اپنے بچے کے آئندہ شب وروز سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ شاید اسی لیے بھی وہ اسے چار چھ بکریاں دے کر باہر کھیتوں کی طرف بھیج دیتے تھے تاکہ مشترکہ گھر کے ہنگاموں سے دور وہ اطمینان سے اپنے اسباق بھی دہرا سکے۔ کیا معلوم آگے چل کر ابن انشا کے ہاں جن جذبات نے اس کے پہلے شعری مجموعے کی درج ذیل نظموں کا روپ دھارا، ان کی بنیادیں گاؤں سے باہر کھیتوں کی ان ہی فضاؤں میں رکھی گئی ہوں۔ خاص طور پر ان میں جن شاموں کا ذکر ہے ان سے انشا جی اپنے بچپن ہی میں آشنا ہو گئے تھے۔ جب کبھی شام ڈھلے اور رات گئے وہ ایک معصوم سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ گھر لوٹتے تھے۔ مثلاً ۱۹۳۵ء میں جب ان کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کہی گئی ان کی نظم 'انتظار کی رات' اس طرح شروع ہوتی ہے:

اُمڈے آئے ہیں شام کے سائے
دم بدم بڑھ رہی ہے تاریکی!

اسی طرح اسی مجموعے میں شامل ان کی کئی دوسری نظموں کے نام اور ان کے آغاز بھی قابلِ غور ہیں۔ مثلاً

اداس رات کے آنگن میں:

اداس رات کے آنگن میں رات کی رانی
مہک رہی ہے ...... دل بیقرار بات تو سن!

خزاں کی ایک شام:

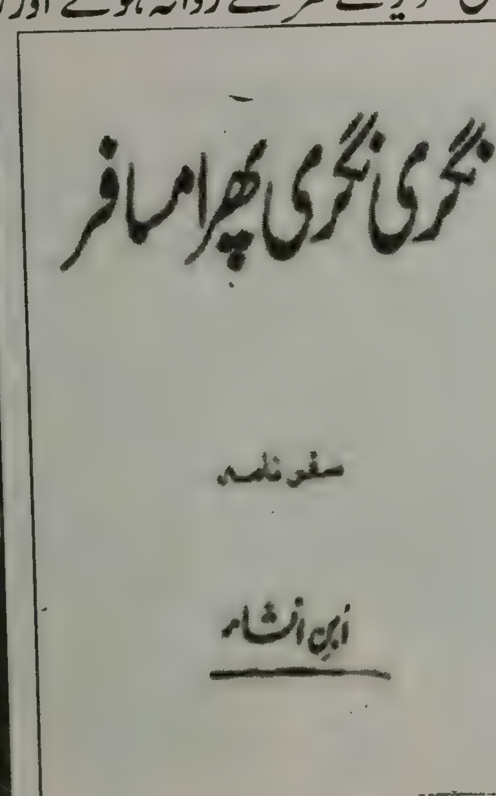
شام ہوئی پر دیسی پنچھی گھر کو بھاگے
دل اپنا ہم کھول کے رکھیں کس کے آگے

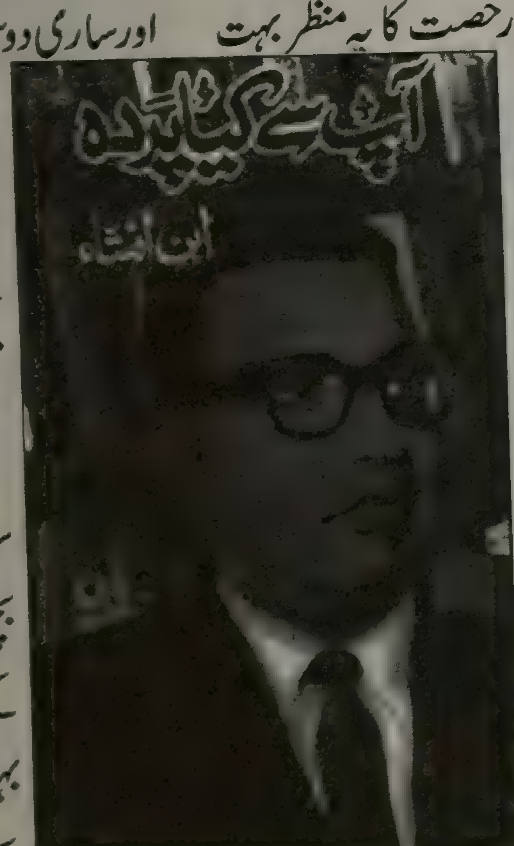
اسی طرح ان کے دوسرے شعری مجموعے "اس بستی کے اک کوچے میں" میں بھی ایسے عنوان موجود ہیں۔ نظم...... 'پھر شام ہوئی' کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

پھیلتا پھیلتا شام غم کا دھواں
اک اداسی کا تنتا ہوا سائباں!

ابن انشا اپنے اس پرائمری سکول میں اپنے تعلیم کے شائق باپ کے معیار پر ان کی امیدوں سے بڑھ کر پورے اترے اور چھٹی جماعت کے امتحان میں اس اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے کہ اپنے گاؤں میں تو پہلی جماعت ہی سے ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ اس سال جب کہ ان کا پرائمری سکول علاقے بھر کا امتحانی مرکز تھا۔ انشا اس میں اول رہے۔ یہ ان کا پہلا بڑا امتحان تھا جس میں اس شاندار کامیابی نے ان کے والد کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔ چنانچہ مزید تعلیم کے لیے منشی خاں نے اپنے بیٹے کو اڑھائی تین میل کے فاصلے پر قصبہ نما گاؤں اپرہ کے مڈل سکول میں داخل کرا دیا جہاں سے انشا جی کو ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کرنا تھا۔ انگریزی کا مضمون ان کے گاؤں تھلہ کے سکول میں بھی نہیں تھا۔ نہ یہاں۔ البتہ ہندی اور گورمکھی لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھیں۔

اپرہ سے ابن انشا کو روزانہ اپنے گاؤں آنا ہوتا تھا کیونکہ وہاں کسی اقامتی ہوسٹل وغیرہ کی سہولت نہیں تھی۔ سردی ہو یا گرمی، برسات ہو یا لو چلے، دیہاتی پگڈنڈیوں پر پانچ چھ میل کی یہ آمد ورفت قریباً دو سال تک انشا جی کا معمول رہا۔ وہ صبح سویرے گھر سے روانہ ہوتے اور رخصت کا یہ منظر بہت جذباتی ہوتا۔ سردار محمود بیان کرتے ہیں کہ:





"ہماری اماں پہلے تو گھر کے دروازے سے بھائی جان کو چوم تھپتھپا کر اور پیار دے کر خدا حافظ کہہ دیتیں اور وہ ایک آدھ بار پیچھے دیکھ کر اپنے راستے پر قدم آگے بڑھانے لگتے۔ اماں کا یہ حال کہ جب تک بیٹا لمبی گلی میں جاتا نظر آتا رہتا ادھر دیکھتی رہتیں اور خدا معلوم اپنے رب سے کیا کیا دعائیں مانگتی رہتیں۔ جونہی وہ گلی کا موڑ مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے وہ خاموشی سے گھر کی چھت پر آ جاتیں اور کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں سے انھیں جاتا ہوا دیکھتی رہتیں۔ تاحدِ نظر، پھر جب وہ اور ان کے تین چار ساتھی طالب علم درختوں کی اوٹ میں غائب ہو جاتے تو کچھ دعائیں پڑھتی نیچے اتر آتیں"۔

"اس زمانے میں گھڑیاں عام نہیں تھیں۔ کم از کم ہمارے گھر میں نہیں تھی لیکن ہماری والدہ کو معلوم ہو جاتا تھا کہ بیٹے کی سکول سے آمد کا وقت قریب ہے۔ چنانچہ وہ کافی دیر پہلے ہی پھر چھت پر پہنچ جاتیں"۔

سردار محمود نے اس طرح کے چند اور واقعات بھی راقم الحروف کو سنائے کہ کس طرح وہ ہر بات میں اپنے بیٹے کا دفاع کرتیں اور تعلیمی معاملات میں ان کا دل بڑھاتیں اور ایک چھٹی گاؤں میں گزار کر جب وہ لدھیانہ کے لیے روانہ ہوتے تو کس طرح وہ ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ خوردنی اشیا کی پوٹلیاں بناتیں اور بار بار انھیں ہدایت کرتیں کہ ہوسٹل پہنچ کر وہ انھیں ضرور اپنے استعمال میں لائیں اور ساری دوستوں میں تقسیم نہ کر دیں۔

اپنے طور پر یہ والہانہ مادرانہ شفقت کتنی دلآویز ہے لیکن دردناک صورت احوال یہ ہے کہ اس سے ابن انشا کی آئندہ زندگی پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے۔

خاص طور پر ان کی پہلی بیوی سے سالہا سال کی علیحدگی (طلاق نہیں) اور اپنے بچوں سے بلا جواز دوری بلکہ ان سے بے باپ کے سے بچوں کا برتاؤ۔ اسی طرح ترقی کے بہترین مواقع کے باوجود صرف ماں کی قربت کے خیال سے کئی اعلیٰ ملازمتوں سے احتراز وانکار کہ فاصلے کی بہت زیادہ دوری ماں بیٹے کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ پھر ماں کے ہر حکم کی تعمیل۔ چاہے اس کے لیے کتنا ہی دکھ سہنا پڑے اور اپنے دوسرے چاہنے والوں کو دکھی کرنا پڑے۔ جس کی انتہا یہ تھی کہ والدہ کے انتقال کے بعد ان کی قبر پر باقاعدہ حاضری اور ان کے پہلو میں دفن ہونے کی تمنا۔ اس والہانہ پن کے اظہار میں انشا بالکل بے بس تھے۔

اس زمانے میں ابن انشا کی عمر چالیس سال سے متجاوز تھی۔ اس غیر متوازن طفلانہ وابستگی نے ابن انشا کی زندگی میں جس طرح دکھ بھرے اس کا خاطر خواہ ذکر ان کی شادی کے بعد کے واقعات میں تفصیل سے آئے گا جو ان کی پہلی بیگم عزیزہ بی بی نے راقم سے بیان کیے جو ۱۹۵۱ء سے تادمِ تحریر ۱۹۸۳ء تک اپنے چھوٹے بھائی عبدالرشید خلجی کے ہاں فیصل آباد کی ایک کالونی میں رہائش پذیر تھیں اور جو ابن انشا کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں ہیں۔ ان خاتون کے ساتھ ابن انشا نے ازدواجی زندگی کے گیارہ سال بسر کیے لیکن پھر اپنی موت تک

قریباً ستائیس سال کوئی سروکار نہ رکھا۔ اگرچہ انھوں نے اس نہایت مہذب اور سادہ دل عورت کو طلاق بھی نہ دی! اور اپنے پہلے تین بچوں عبدالستار، محمد انوار اور اپنی بیٹی راحت بانو کو بھی وہ محبت اور پدرانہ شفقت مہیا نہ کی جس کے وہ ہر لحاظ سے مستحق تھے لیکن قابل رحم کیفیت یہ ہے کہ خود ابن انشا بھی اس صورت واقعات سے خوش نہ تھے۔ کراچی تعیناتی کے دوران ابن انشاء نے پہلی بیوی کو کراچی لے جانے کی کوشش کی۔ ساس بہو کے اختلاف کی وجہ سے یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔ انھیں ماں کے احکامات کی بجا آوری اور بیوی بچوں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری...... دونوں میں سے ایک کو بچانا تھا۔ انھوں نے ماں کے جذبات کو ترجیح دی۔ ابن انشا کا بیٹا انوار تو چھوٹی عمر میں انتقال کر گیا لیکن اس خاتون سے انشاجی کے باقی دونوں بچوں یعنی عبدالستار اور راحت بانو نے انشاجی کے والدین کے گھر میں ہی اپنی دادی اور پھوپھیوں کی زیرنگرانی پرورش پائی اور شادی بیاہ کے بعد گھر بار والے ہوئے۔

بہرحال اپرہ میں ابن انشا نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل اور ورنیکر مڈل کے امتحان میں بھی علاقے بھر میں اول رہ کر اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھا۔

اب انگریزی کی کمی پوری کرنے اور مزید تعلیم کے لیے ان کی اگلی منزل لدھیانہ تھی جہاں چاند کے اس تمنائی کے لیے

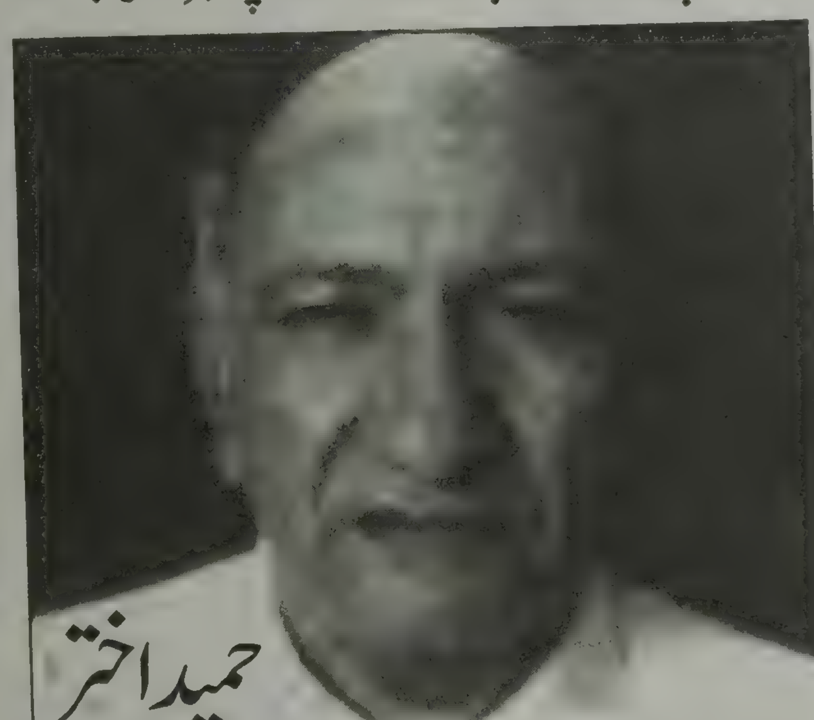
صد ہزار باتیں تھیں حیلۂ شکیبائی!

کرۂ ارض پر دوسری عالمی جنگ کے مہیب بادل چھا چکے تھے جب ابن انشا نے ۱۹۳۹ء کے موسم بہار میں گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ کی سینئر سپیشل کلاس میں داخلہ لیا۔ جس میں انھیں صرف انگریزی کا مضمون پڑھ کر ہائی کلاسوں میں پہنچنا تھا اور انگریزی کے ساتھ کوئی اور زبان...... فارسی وہ شروع سے پڑھتے آ رہے تھے اور انھیں اس زبان سے شغف بھی تھا چنانچہ یہاں انھوں نے فارسی اور ہندی کو بطور اختیاری مضمون ترجیح دی۔

گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ ہی میں ابن انشا نے شعرگوئی کا باقاعدہ آغاز کیا اور اپنے تخلص کے بارے میں سنجیدہ ہوئے۔ پرائمری سکول تھلہ سے فراغت پر وہ شیر محمد اصغر تھے۔ یہاں سے اپرہ وارد ہوئے تو شیر محمد مایوس عدم آبادی ہو گئے اور ورنیکر مڈل کر کے لدھیانہ پہنچتے پہنچتے شیر محمد مایوس صحرائی ہو چکے تھے۔ ممکن ہے کسی کم ظرف شہری طالب علم نے دیہاتی ہونے کا طعنہ دے دیا ہو۔ چنانچہ انھوں نے بندۂ صحرائی بننا زیادہ پسند کیا۔ اس روداد کا ذکر بھی ان ہی کی زبانی سنیے:

''سب سے پہلا تخلص اصغر تھا، پھر مایوس عدم آبادی، پسند آیا۔ ان کے اردو اور فارسی کے استاد مولوی برکت علی لائق نے انھیں بتایا کہ 'مایوس' اچھا تخلص نہیں ہے پھر 'قیصر' کا دُم چھلا لگایا۔ 'قیصر یا قیصر صحرائی' بھی رہے لیکن چھپے تو ''ابن انشا'' کے نام سے، یہ نام سکول ہی کے زمانے میں عمر کے پندرھویں سولھویں سال ہی اختیار کر لیا تھا، سکول میں مضامین اسی نام سے چھپتے، اگرچہ شاعری 'قیصر' کے تخلص سے کی''۔

ابن انشا کو کتابیں پڑھنے کا بہت چسکا تھا۔ وہ ہائی سکول لدھیانہ کے ذہین طلبا میں شمار ہوتے تھے، ایک مسلمان نوجوان کے لیے ہندو اور سکھ طلباء کے مقابل آ جانا قابل فخر بات تھی۔ میٹرک کے امتحان میں انھوں نے پنجاب بھر میں پہلی پوزیشن لی، درسی کتابوں پر دسترس کے علاوہ وہ سکول کی علمی و ادبی مجلسوں کی جان بھی تھے۔ اپنے ہر سال بدلتے



تخلصوں سے مطمئن نہیں تھے چنانچہ ادبی ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے اپنا نام ابنِ انشا رکھ لیا۔ میٹرک کے امتحان میں کامیابی پر ان کا وظیفہ مقرر ہوا لیکن یہ رقم کالج کے تعلیمی اخراجات کے لیے کافی نہیں تھی۔ ادھر اس کے والد منشی خاں بھی مزید تعلیم بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے۔ ابن انشا دوسری جنگ عظیم کے ان دنوں اپنی وہ بعض نظمیں کہہ چکے تھے جو ۱۹۴۴ء میں اس کے شائع ہونے والے اولین شعری مجموعے ''تلخیاں'' میں شامل اشاعت ہیں۔ ابن انشا کے لیے یہ دن بڑی سوچ بچار کے تھے کوئی ملازمت یا مزید تعلیم؟ ادھر دنیا جنگ کی لپیٹ میں تھی جس کی وجہ سے پورے خطے میں بیروزگاری بھوک کا راج تھا، وہ میٹرک کے امتحان سے فراغت کے بعد اپنے گاؤں پہنچا جہاں ہمیشہ سے والہانہ محبت کرنے والی والدہ کے ساتھ ساتھ ایک رفیقۂ حیات بھی اس کی منتظر تھی۔ اس کے برعکس گھر کے ماحول میں اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں۔ حتیٰ کہ کوئی اخبار و رسائل تک میسر نہیں تھے چنانچہ وہ کچھ ہی عرصہ گاؤں میں رہنے کے بعد ملازمت کے حصول کے سلسلے میں لدھیانہ پہنچے اور پھر ایک ہم جماعت کے ہمراہ بٹھنڈہ آ گئے جہاں سے حمید اختر کے ساتھ خط و کتاب کا سلسلہ جاری رہا جو کہ لاہور آمد کا ذریعہ بن گیا۔ لاہور آ کر حمید نظامی سے رابطہ کیا تو انھوں نے اس نوجوان کو اسلامیہ کالج میں داخل کرا دیا اور ساتھ ہی نوائے وقت کی بالائی منزل پر رہائش کا بھی بندوبست کر دیا۔ لاہور متحدہ ہندوستان میں کالجوں کا شہر کہلاتا تھا جس کی ایک اپنی ہی علمی، سیاسی، ادبی، ثقافتی اور صحافتی فضا تھی۔ نامور شعراء ادیب صحافی پھرنت نئے سیاسی، ادبی اور ثقافتی ہنگامے لاہور کی روزمرہ کی زندگی کا لازمہ تھے اس سے پہلے بڑے ادیبوں شاعروں کا ابن انشا نے ان کا صرف نام سنا تھا۔ وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے۔ اسلامیہ کالج کے سامنے عرب ہوٹل ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا اڈا تھا۔ ان میں زیادہ تر لکھنے والے ایسے اداروں میں کام کرتے تھے جہاں تنخواہ قلیل ملتی تھی۔ بروقت نہیں ملتی تھی لیکن وہ سب اپنے حال میں مست رہتے۔ چراغ حسن حسرت اس مجلس کے امیر تھے۔ ابن انشا کو بھی عام طور پر اسی ہوٹل سے کھانے کا اہتمام کرنا پڑتا۔ یہ ہوٹل بڑا ہی غریب نواز تھا۔ اگر کسی کی جیب میں پیسے نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کھانے اور چائے سے محروم رہے۔ ادیبوں کا دوسرا بڑا ٹھکانہ نیلا گنبد کے پاس چائے کی مختصر سی دکان 'نگینہ بیکری' تھی۔ چراغ حسن حسرت کی سرکاری ملازمت میں چلے جانے کے بعد عرب ہوٹل کی رونقیں درہم برہم ہو گئیں اور نگینہ بیکری آباد ہو گئی۔ مولانا صلاح الدین احمد ''ادبی دنیا'' کا دفتر بھی قریب ہی مال روڈ پر تھا۔ بہت سے شاعر ادیب یہاں بھی باقاعدگی سے آنے لگے۔

ابن انشا کے لیے لاہور کی ان فضاؤں میں بسر ہوتے یہ شب و روز یقیناً دلآویز تھے، وہ شہر کی ہر تقریب میں پہنچتے اور اس کا احوال حمید اختر کو لکھ دیتے۔ ابن انشا اب مایوس نہیں تھے اور تصویر کا رخ روشن ان کے پیش نظر تھا۔ اب وہ حمید اختر کو بھی خط کے جواب میں مایوسی سے بچنے کی تلقین کرتے۔ وہ مجید نظامی سے اخبار کے کام میں ہاتھ بٹاتے۔ آہستہ آہستہ ابن انشا کی پڑھائی کا کام کم ہونے لگا اور اخبار کا کام بڑھتا گیا اور انشاجی اس میں سمٹ کر رہ گئے، اب لاہور کی روشن سڑکیں انھیں تاریک نظر آنے لگیں اور بالآخر چار ماہ کے بعد لدھیانہ واپس لوٹ آئے۔ جہاں والدین اور ان کی بیوی اور ان کا ننھا بیٹا ان کا منتظر تھا بعدازاں وہ بیوی کے ہمراہ شہر سسرال آ گئے۔ اب اس کی شامیں دوست حمید اختر کے ساتھ گزرتیں۔

نوکری کی تلاش جاری تھی کہ مارچ ۱۹۴۳ء میں انبالہ چھاؤنی کے ملٹری اکاؤنٹس سے محرر صغیر کی ملازمت کا بلاوا آ گیا۔ ان دنوں حمید اختر میٹرک کا امتحان دے رہے

تھے۔ دفتر چھٹی کے بعد وہ لائبریری کا رخ کرتے اور فارغ اوقات میں کلیات میر کا مطالعہ کرتے۔ بعدازاں وہ پرائیویٹ طور پر منشی فاضل کا امتحان بھی دے گئے۔ اس دوران ملٹری اکاؤنٹس سے منسلک دوست لوک پال سیٹھی ان کے بہت کام آئے۔ وہ کافی پڑھے لکھے تھے۔

ابن انشا اس زمانے میں شعر وشاعری کا باقاعدہ آغاز کر چکے تھے۔ گھر میں اختلاف کی وجہ سے ان کی شادی اب ایک سانحہ بنتی جارہی تھی۔ ان کے پہلے شعری مجموعے 'چاند نگر' کی ابتدائی نظمیں ان کی اسی زمانے کی ذہنی کیفیات کی غماز ہیں۔

میری منزل ہے بے نشاں ناداں!
ساتھ میرا ترا کہاں ناداں؟

اس کے بعد انھوں نے نکولس کے ایک ناول کا ترجمہ کیا جسے وہ آپ بیتی کہتے ہیں اسے انھوں نے "محبوبہ" کے نام سے شائع کیا، یہ ان کی پہلی نثری ادبی کاوش تھی۔ ۱۹۴۴ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد اگلے سال ایف اے انگریزی کے پرچے میں کامیاب ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا، بعدازاں وہ امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ اور پرسا انسٹی ٹیوٹ دہلی میں ملازم ہوئے۔ یہاں وہ ایک رسالے کی مجلس ادارت سے منسلک ہوئے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت کی درخواست دی، بلاوا آ گیا، لیکن وہاں حاضری کی نوبت نہ آئی کیونکہ اگست ۱۹۴۷ء کا تاریخی مہینہ آ چکا تھا اور متحدہ ہندوستان کے ملازمین دونوں نئے ممالک میں تقسیم کیے جارہے تھے۔ یہاں ان کی ملاقات معروف ریڈیو میزبان شکیل احمد اور ایک ہمدرد کار احمد حسن شیخ سے ہوئی۔ یہ سب لوگ ریڈیو پاکستان میں شمولیت پر آمادگی کا اظہار کر چکے تھے۔ ابن انشا کا بھی اب نیا وطن پاکستان تھا، ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ادھر دلی کی فضا بگڑنے لگی۔ ایک روز تو چند سکھ کرپانیں باندھے ہمارے کمرے میں دندناتے چلے آئے، آخر ہم نے دلی سے کنارہ کیا اور اپنے گاؤں انبالہ پہنچ کر اگلے ہی دن پاکستان کی راہ لی۔ اس دوران حمید اختر بھی ان کو ملنے گاؤں آ گئے۔ اب ابن انشا کا نیا وطن پاکستان تھا۔ اس مملکت کا جیتا جاگتا شہر لاہور ان کی نئی منزل جہاں سے تقریباً ساڑھے چار سال پہلے کسمپرسی کے عالم میں لدھیانہ سدھارے تھے، لیکن اب اور تب میں بہت فرق تھا۔ ان کے اہل خانہ بعدازاں چند دن بعد ان سے آن ملے۔

اب لاہور کے لکشمی چوک کے ہوٹلوں میں سرشام محفلیں جمتیں جن میں ابن انشا، احمد ندیم قاسمی، حمید اختر، ظہیر کاشمیری، احمد راہی، عبداللہ ملک، قتیل شفائی، اے حمید اور بہت سے نئے لکھنے والے جمع ہوتے۔ چپ چاپ رہنے والا ابن انشا اب بولنے لگا۔ رسالہ "سویرا" میں احمد راہی نے ابن انشا کا تعارف اپنے ادارتی صفحات میں کر دیا، ان کا نام علمی و ادبی حلقوں کے معروف ناموں میں شمار ہونے لگا، انھی دنوں مولانا چراغ حسن حسرت سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس وقت روزنامہ امروز سے وابستہ تھے۔ ریڈیو کے بعد کبھی "امروز" کبھی "سویرا" اور کبھی 'ادب لطیف' کے دفاتر میں فراغت کے لمحات بسر کرتے اور اے حمید کے ساتھ شہر کی گلیوں میں مٹرگشت کرتے۔ شام کو "ٹی ہاؤس" آ جاتے جہاں سبھی دوست موجود ہوتے۔ انھی ایام میں (۴۹-۱۹۴۸ء) میں وہ مختلف چینی شاعروں کی نظموں کے انگریزی تراجم پڑھنے لگے اور اردو میں ان کے ترجموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ نظمیں ان کے اپنے احوال کے قریب تھیں۔ انھوں نے "ٹھنڈا پربت" کے نام سے انھیں اردو میں منتقل کر دیا۔

میں ٹھنڈے پربت کا راہی
اس راہ کا کتنا سہل نہیں

ریڈیو ملازمت کے دوران انھوں نے ایم اے اردو میں داخل ہونے کی درخواست ریڈیو حکام کو دی جو کہ قبول کر لی گئی۔ ابن انشا کا مزاج ان لکھنے والوں کا سا تھا جن کے خیال میں حقیقت اساطیری کہانیوں اور پراسرار داستانوں میں تاریخی حقائق سے کہیں زیادہ ملتی ہے۔ وہ امروز میں مضامین لکھتے اور ان کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔

وہ چار و ناچار اپنے شب و روز بسر کیے جارہے تھے کہ ۱۹۴۹ء میں دو اہم واقعات سرکاری ملازمین کے لیے حکومت کے قائم تنخواہ کمیشن کی وجہ سے (مترجمین کے ساتھ ناروا سلوک کی وجہ سے) ان کی ترقی کا رکنا اور ریڈیو پاکستان لاہور سے خبروں کا یونٹ کراچی منتقل ہونے سے انھیں ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ استعفیٰ کے لیے گھر کے حالات اجازت نہیں دے رہے تھے، بالآخر کراچی جانا پڑا اور کراچی ہی کے ہو کے رہ گئے۔ کراچی اس وقت پاکستان کا دارالخلافہ تھا۔ شروع میں انھیں یہاں کے حالات سے مطابقت پیدا کرنے میں سخت جدوجہد کرنا پڑی۔ انھیں ۱۹۵۰ء میں ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ اسی دوران ابن انشا نے ایم اے اردو کے لیے اردو کالج کراچی میں داخلہ لیا اور ساتھ ہی انھیں کالج کے ادبی مجلّے "برگِ گل" کی ادارت کا اعزاز بھی ملا، بابائے اردو مولوی عبدالحق کی سرپرستی اس ادارے کو حاصل تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے آخری اور بہت سخت زمانے میں ان سے نہایت مخلصانہ نیازمندی برقرار رکھی اور انھیں انجمن واپس کرانے کا ایک بڑا وسیلہ ثابت ہوئے۔ یہ داستان بابائے اردو کے کتابچے "انجمن کا المیہ" میں موجود ہے۔ ابن انشا کا اردو کالج کے حوالے سے بابائے اردو کے ساتھ ایک شاگردانہ تعلق قائم رہا۔ وہ ان کے مخلص خاموش مگر باعمل کارکن ثابت ہوئے۔ وہ بابائے اردو کی طرف سے ان کے نیازمندوں اور دوستوں کے خطوط کے جواب بھی لکھنے لگے، دو سال بعد دستور ساز اسمبلی کی ملازمت چھوڑ کر محکمہ دیہات سدھار ے تو مصروفیات کے باعث اس خدمت کی بجا آوری میں پہلا سا معیار قائم نہ رکھ سکے۔ اس نئے ادارے میں حفیظ جالندھری، احمد بشیر اور ممتاز مفتی بھی ان کے ساتھ ملازم تھے۔ اسی دوران ان کا مجموعہ "چاند نگر" بھی شائع ہوا۔ انھوں نے "ادارہ مطبوعات فرینکلن" میں بھی مترجم کی خدمات سرانجام دیں جہاں کئی کتابیں انھوں نے اردو میں ترجمہ کیں۔ ان دنوں اس ادارے سے مولانا صدرالدین، مولانا عبدالمجید سالک، انتظار حسین اور اشفاق احمد جیسے نامور ادیب منسلک تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھنے اور کہانیاں ترجمہ کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ پھر ادارۂ مطبوعات پاکستان کے لیے پاکستان کی علاقائی زبانوں کی شاعری کو بھی اردو کے منظوم روپ میں ڈھالا۔ مولانا چراغ حسن حسرت کی وفات کے بعد روزنامہ "امروز" کے کراچی ایڈیشن کی خدمات ان کے سپرد ہوئیں۔ اس میں وہ کالم نگاری بھی کرتے رہے۔ پھر کئی روزناموں اور رسالوں میں باقاعدہ لکھتے رہے، ان کالموں نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ وہ "پاکستان رائٹرز گلڈ" کی مجلس عاملہ میں بھی رہے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ "اس بستی کے اک کوچے میں" شائع ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں سرکاری دورے پر بیلجیم گئے جہاں دنیا بھر کے شاعروں کا اجتماع تھا۔ اس میں انھوں نے پاکستان کی نمائندگی کی، اس دوران وہ دیگر کئی ممالک بھی گئے جہاں وہ کتاب ساز اداروں اور پبلشروں سے ملے تاکہ نیشنل بک سنٹر کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی اہلیت اور استحقاق ثابت کر سکیں۔ ۱۹۶۴ء میں وہ اس ادارے کے سربراہ ہوئے۔

۱۹۶۹ء میں والدہ کے اصرار پر شکیلہ بیگم کے ساتھ ان کی دوسری شادی ہوئی۔ یہ شادی ممتاز مفتی کی بیگم کی وساطت سے ہوئی۔

۲۶ فروری ۱۹۷۷ء کو علاج کی غرض سے ابن انشا لندن روانہ ہوئے۔ لندن قیام کے دوران مختلف شاعر ادیب دوستوں سے خط و کتابت جاری رہی جن میں احمد ندیم قاسمی، بیگم سرفراز اقبال اور کشور ناہید وغیرہ شامل ہیں۔ اس دوران بھی وہ "جنگ" کے لیے کالم لکھتے رہے اور اس دوران وہ برٹش میوزیم کتب خانے سے مستفید بھی ہوتے رہے اور کئی کتابوں، مخطوطوں اور قیمتی دستاویزات کی مائیکروفلمیں بنوا کر پاکستان بھیجیں۔ اس دوران وہ پاکستانی سفارتخانے سے بھی عارضی طور منسلک رہے۔ لندن قیام کے دوران اسی سال دسمبر میں ان کی حالت تشویشناک ہوگئی اور گیارہ جنوری ۱۹۷۸ء کو ابن انشا اکاون برس کی عمر میں دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو

☆☆☆☆

انتظار حسین

انتظار حسین کئی تخلیقی جہتوں کے مالک ہیں۔ وہ کالم نگار ہیں، افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں، نثر نگار، ادیب اور دانشور ہیں۔ انتظار حسین ایک ایسے تخلیق کار کا نام ہے جس نے ایک پورے عہد کے تجربے کو زبان اظہار کی صورت عطا کی ہے۔ ان کا افسانوی سفر کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کا نام ''مین بکر انٹرنیشنل پرائز ۲۰۱۳ء'' کی عالمی سطح پر ادب میں نمایاں خدمات سرانجام دینے والے دس ممالک کے ادیبوں کی فہرست میں شامل تھا جو کہ ہم سب کے لیے اعزاز کی بات ہے۔ انتظار حسین پاکستان ہی نہیں ایشیا کے واحد اردو دان ہیں جنھیں اس فہرست میں شامل کیا گیا یہ ان کی فنی خدمات کا اعتراف ہے۔ ان کی اب تک درجنوں تخلیقات سامنے آ چکی ہیں جن میں نمایاں یہ ہیں:

مجموعے: چراغوں کا دھواں، دلی تھا جس کا نام، اجمل اعظم، بوند بوند، جنم کہانیاں، قصہ کہانیاں، بستی، تذکرہ، چاند گرہن، آگے سمندر ہے۔

افسانے: خیمے سے دور، زمین اور فلک اور، آخری آدمی، کنکری، دن اور داستان، خالی پنجرہ، گلی کوچے، کچھوے، شہر افسوس، شہزاد کے نام، ملاقاتیں، نظریے سے آگے وغیرہ۔

تراجم: گھاس کے میدانوں میں (ناول)، چیخوف، فلسفہ کی نئی تشکیل (فلسفہ) جان ڈیوی An unwritten & other stories، نئی پود، ناؤ اور دوسری منتخب کہانیاں، سرخ تمغہ وغیرہ۔

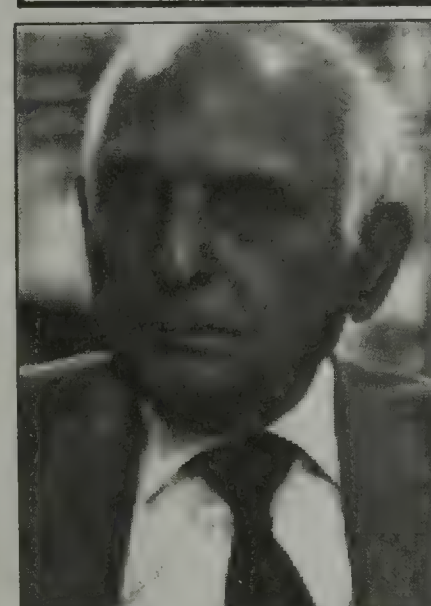
سفرنامے: نئے شعر پرانی بستیاں، زمین اور فلک وغیرہ اور کئی تحریریں و مقالے انتظار حسین کے اس کے علاوہ ہیں۔

مسعود اشعر

ہمیں انعام نہیں ملا

اس گرمی میں کچھ بھی تو کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جب دم ہی گھٹا جا رہا ہے تو بھلا آدمی کر ہی کیا سکتا ہے۔ یہاں تو زندہ رہنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ ''مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے'' اس لیے جیئے جاتے ہیں۔ جیئے جاتے ہیں یہ دیکھنے اور سننے کو کہ ''بین الاقوامی بکر انعام'' ہمیں نہیں ملا۔ ملا بھی تو کس کو؟ ایک امریکی خاتون کو، جن کی خوبی محض یہ ہے کہ وہ دو دو تین تین سطروں یا زیادہ سے زیادہ صفحے ڈیڑھ صفحے کی کہانیاں لکھا کرتی ہیں لیکن یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اگر انگریزی میں ہی دیکھا جائے تو ابھی ایک دو سال پہلے تک اخبار گارڈین میں چھوٹے چھوٹے افسانچے یا مختصر ترین افسانے چھپا کرتے تھے۔ فارسی میں آپ شیخ سعدی کی گلستان میں ایسی حکایات پہلے ہی پڑھتے رہے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' چند سطروں کے افسانے ہی تو ہیں۔ ان چند سطروں میں منٹو نے جو بات کہہ دی ہے وہ شاید پوری کتاب میں بھی نہ کہی جا سکے۔ اچھا منٹو کو جانے دیجیے اردو میں مختصر افسانے یا افسانچے لکھنے کا رواج تو اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ لکھنے والوں نے ان سے ہاتھ ہی کھینچ لیا۔ احسان بی اے اور ایک شیخ صاحب ایسے افسانے لکھتے تھے۔ ان کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ انگریزی والوں کو تو اس کا علم نہیں ہو گا مگر گارڈین کے چھوٹے افسانے تو ان تک ضرور پہنچے ہوں گے بلکہ منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' کا بھی انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔

بکر انعام کے منصف حضرات کا فرمانا ہے کہ امریکی خاتون لیڈیا ڈیوس کے ہاں Imaginative Narrative پایا جاتا ہے۔



اس کا ترجمہ آپ ''غیر معمولی تخیلاتی بیانیہ'' کر سکتے ہیں۔ مگر یہ غیر معمولی بیانیہ تو ان باقی نو ناول نگاروں میں سے کئی ایک کے ہاں اس سے بھی زیادہ موجود ہے اور ہم یہ بات ان ناول نگاروں کو پڑھے بغیر نہیں کہہ رہے ہیں۔ آصف فرخی کی مہربانی سے ہم ان کے رسالے ''دنیا زاد'' میں ان دس کے دس ناول نگاروں کی منتخب تحریریں پڑھ چکے ہیں اور سوائے اس کے کہ امریکی خاتون چند سطروں میں بات کرتی ہیں ہمیں ان کے اندر اور کوئی خوبی نظر نہیں آتی اور وہ چند سطروں کی باتیں بھی ہمارے جیسے پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر کوئی پائیدار تاثر نہیں چھوڑتیں۔ خود منصفوں نے کہا ہے کہ ''یہ افسانے ہیں یا حکایات، یا پھر ہم انھیں اقوال زریں کی صنف میں شامل کر لیں'' تو پھر انھیں ناولوں اور افسانوں میں شامل کیوں کیا گیا؟ ہندوستان کے انتھ مورتی نے تو اسی وقت احتجاج بھی کیا تھا لیکن ان کا احتجاج یہ تھا کہ اس مقابلے میں دوسری زبانوں سے انگریزی میں ترجمہ کیے جانے والے ناولوں اور افسانوں کے ساتھ انگریزی میں لکھی جانے والی طبع زاد تحریروں کو شامل کیوں کیا گیا؟ لیکن اس کا جواب تو موجود تھا کہ یہ بین الاقوامی انعام ان ملکوں کے ادیبوں کو دیا جاتا ہے جو انگریزوں کی غلامی میں نہیں رہے۔ انگریزوں کی غلامی میں رہنے والوں کو اصل ''مین بکر انعام'' دیا جاتا ہے۔ یہ انٹرنیشنل انعام تو پچھلے سال فلپ روتھ کو بھی دیا گیا تھا، جو امریکی ہے۔

ہمیں یہ صدمہ نہیں ہے کہ ہمارے انتظار حسین کو یہ انعام کیوں نہیں ملا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہندوستان کے انتھ مورتی جیسے دنیا کے اور بھی بہت بڑے ناول نگار اس مقابلے میں موجود تھے، اور وہ سب نظر انداز کر دیے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ذوق کا قصور ہو، مگر ہمیں تو دوسرے کئی لکھنے والے زیادہ اچھے لگے اور ہمیں انتھ مورتی کی یہ بات بھی اچھی لگی کہ ''مجھے انتظار حسین کے ساتھ اس فہرست میں شامل ہونے پر زیادہ خوشی ہے کہ ہم دونوں ہی ثقافتی دوریاں ختم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں''۔ اب آپ انعام یافتہ خاتون لیڈیا ڈیوس کی ایک دو کہانیاں بھی پڑھ لیجیے۔ ایک کہانی کا عنوان ہے ''ماں''

لڑکی نے ایک کہانی لکھی۔ ''لیکن کتنا اچھا ہوتا کہ تم ایک ناول لکھو'' اس کی ماں نے کہا۔ لڑکی نے گڑیا کا گھر بنایا۔ ''لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر یہ سچ مچ کا گھر ہوتا''۔ اس کی ماں نے کہا۔ لڑکی نے اپنے باپ کے لیے چھوٹا سا تکیہ تیار کیا ''لیکن کیا لحاف زیادہ فائدہ مند نہ ہوتا؟'' اس کی ماں نے کہا۔ لڑکی نے باغیچے میں چھوٹا سا گڑھا کھودا۔ ''لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر تم نے بڑا گڑھا کھودا ہوتا''۔ اس کی ماں نے کہا۔ لڑکی نے زیادہ بڑا گڑھا کھودا اور اس میں لیٹ کر سو گئی۔ ''لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر تم ہمیشہ کی نیند سو جاتیں''۔ اب دوسری کہانی پڑھ لیجیے۔ عنوان ہے ''مصروف سڑک''۔

میں اب اس سے اتنی مانوس ہو گئی ہوں
کہ جب ٹریفک کا شور تھم جاتا ہے
مجھے لگتا ہے کوئی طوفان آنے والا ہے

ایک اور کہانی۔ عنوان ہے ''اپنے جسم کو جاننا''

''اگر تمہارے آنکھوں کی پتلیاں حرکت کر رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے تم سوچ رہے ہو یا سوچنا شروع کرنے والے ہو۔ اگر تم اس مخصوص لمحے میں سوچنا نہیں چاہتے تو کوشش کرو کہ تمہاری آنکھوں کی پتلیاں ساکت رہیں''۔

یہ ہیں ان افسانچوں یا مختصر ترین کہانیوں میں سے چند کہانیاں جو آصف فرخی اور انور رائے نے انگریزی سے ترجمہ کی ہیں۔ یہ کہانیاں پڑھنے لائق تو ہیں۔ پڑھنے میں اچھی بھی لگتی ہیں لیکن کیا یہ بڑا ادب ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ ان کے مقابلے میں جو دوسری تحریریں ہم نے پڑھیں ان میں سے کئی ایسی ہیں جو کم سے کم ہمیں تو زیادہ اچھی لگیں۔ انتظار حسین کا ناول ''بستی'' ہی ایک پورے دور کی داستان ہے اور کیا ہولناک داستان ہے۔ خیر، ہم اس بات پر ہی خوش ہو لیتے ہیں کہ پاکستان کے کسی ناول نگار کو اس انعام کے لیے ''دس بڑوں'' میں شامل تو کیا گیا۔ اردو زبان کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم تو کیا گیا۔ ہم تو وہ تصویر دیکھ کر ہی باغ باغ ہو گئے تھے جو اس انعام کے اعلان سے ایک دن پہلے برطانیہ کے اخباروں میں چھپی۔ ہمارے انتظار حسین دنیا کے دوسرے نو بڑے ادیبوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ (بشکریہ: روزنامہ جنگ)

حیدر قریشی (جرمنی)

عالمی ادبی انعامات اور اردو دنیا

ادبی انعامات ہماری اردو دنیا کے ہوں یا عالمی نوعیت کے ہوں، یہ کبھی بھی میرا مسئلہ یا موضوع نہیں رہے۔ مقامی، قومی اور بین الاقوامی، ہر سطح پر جو تعلقات عامہ اور طاقت ور لابی کا بندہ ہوتا ہے، وہ انعام جیت جاتا ہے۔ یہ کوئی چوہا دوڑ نہیں بلکہ ہاتھی دوڑ ہوتی ہے۔ قومی سطح پر نذیر ناجی اور ڈاکٹر ظہور اعوان کے تحریر کردہ ذاتی تجربات پڑھنے کے بعد اس کھیل کی ساری حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ عالمی سطح کے انعامات میں بھی یہی منظر بڑی سطح پر ہوتا ہے۔ میں مقامی نوعیت سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کی اس انعامی کھیل سے تھوڑا بہت باخبر تو رہتا ہوں لیکن اسے میں نے کبھی موضوع نہیں بنایا۔

اس برس ''دی مین بکر پرائز ۲۰۱۳'' کا اعلان ہوا اور اردو کے بعض لکھنے والوں کا اس پر ردِعمل سامنے آیا تو اس بکر پرائز کا سارا منظر نامہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ لگ بھگ، پانچ ماہ پہلے مسعود اشعر کے کالم میں یہ نوید دی گئی کہ اس بار اس انعام کے ٹاپ ٹین میں اردو کے انتظار حسین بھی شامل ہیں۔ کچھ اور کالم نگار ادیبوں نے بھی اس کا چرچا کیا اور بی بی سی کی اردو ویب سائٹ تک سے کام لے کر لابنگ کا عمل جاری رکھا گیا۔ ٹھیک ہے۔ یہ سب اپنی لابی کو مستحکم کرنے کا طریق تھا، اچھا کیا گیا، لیکن جب مئی ۲۰۱۳ء میں بکر پرائز کا نتیجہ سامنے آیا، تو امریکی افسانچہ نگار Lydia Davis کے افسانچوں نے بڑے بڑے ناولوں کو ڈھیر کر دیا۔ لیڈیا ڈیوس اس سال کا انعام جیت گئیں۔ اندازہ ہوا کہ ان کی لابی زیادہ مضبوط اور مؤثر تھی۔ اگر انتظار حسین کی لابنگ زیادہ مضبوط ہوتی تو یقینی طور پر وہ یہ انعام جیت جاتے۔ ایسا نہیں ہوا، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہی بہت ہے کہ وہ اس انعام کے ٹاپ ٹین میں شامل رہے۔

ناصر بشیر

استادوں کے استاد

انتظار حسین مجھے ہمیشہ سے ایک پُراسرار آدمی دکھائی دیتے ہیں، بہت سوں نے انھیں پاک ٹی ہاؤس کی درمیانی میز پر زاہد ڈار کے ساتھ بیٹھے دیکھا ہوگا، کچھ آج کل انھیں نیر علی دادا کی بنائی ہوئی ''نیرنگ آرٹ گیلری'' میں دیکھتے ہیں۔ میں نے انھیں جیل روڈ والے اس خاموش اور پراسرار مکان میں بار بار چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے دیکھا ہے جس کے در و دیوار بہت سی افسانوی کتابوں کی تخلیق کے امین ہیں۔ میں اکثر اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ چائے خانوں آرٹ گیلریوں، ادبی تقریبات اور تخلیق کار دوستوں کو پورا وقت دینے والے انتظار حسین اتنی موٹی موٹی کتابیں کب لکھتے ہیں؟ مطالعہ کب کرتے ہیں؟ مطالعے کے حوالے سے ایک بار انھوں نے میرے ہی سوال کے جواب میں کہا تھا کہ بعض کتابیں میں سونگھ کر رکھ دیتا ہوں اور اپنا وقت ضائع کیے بغیر جان لیتا ہوں کہ ان میں کیا ہے۔

سعدیہ قریشی

انتظار حسین اور عالمی ادبی ایوارڈ

عالمی سطح پر دیے جانے والے ادبی ایوارڈز کی خبر کو ہمارے ادبی حلقوں میں دلچسپی سے سنا جاتا ہے، اس لیے کہ ادب کسی بھی زبان میں تخلیق ہو، اس میں جس زندگی...... اور زندگی سے جڑی خواہشوں، حسرتوں، خوشیوں اور غموں کی تصویر پیش کی جاتی ہے، وہ دنیا میں بسنے والے تمام لوگوں کے لیے ایک جیسی ہوتی ہے۔ ادب کسی بھی زبان میں ہو، اس آئینے پر ہر شخص اپنے خدوخال پہچان لیتا ہے۔ اس برس بھی مین بکر انٹرنیشنل پرائز (Man Booker International Prize 2013) کا اعلان ہوا جس کے مطابق امریکی مصنفہ، ۶۳ سالہ لیڈیا ڈیوس کو ایوارڈ کا حق دار قرار دیا گیا۔ اس خبر میں ہماری دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ادب کے اس قابل قدر ایوارڈ کے لیے دس ادیبوں کی حتمی فہرست میں اردو ادب کے ممتاز ادیب اور پاکستان کا اعزاز جناب انتظار حسین کا نام بھی شامل تھا۔ پاکستان کے علاوہ روس، امریکہ، چین، بھارت، فرانس، اسرائیل، سوئٹزر لینڈ، کینیڈا سے تعلق رکھنے والے اہم مصنفین کے نام حتمی فہرست میں شامل تھے۔ یہ ایوارڈ کسی ادیب کی عمر بھر کی تخلیقی کاوشوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ مصنف یا تو انگریزی زبان میں لکھتا ہو یا پھر اس کا کام انگریزی زبان میں ترجمہ ہوا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں ہمارے ہاں صرف عبداللہ حسین، انتظار حسین، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ جیسے بڑے نام ہی موجود نہیں بلکہ ایک پوری کہکشاں ہے، ادیبوں، افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی جن کے نام درج کرنے لگیں تو پھر کچھ اور لکھنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ مگر ہمارے ادیبوں کا شاندار کام عالمی سطح پر متعارف ہونے سے اس لیے رہ جاتا ہے کہ ہمارے ہاں اردو ادب کی بہترین کتابوں کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کا کوئی باقاعدہ سلسلہ موجود نہیں۔ ہمیں اس وقت ضرورت ہے کہ اس سطح کا ایک ادبی ادارہ انگریزی زبان کے حوالے سے قائم ہو۔ انگریزی کے پروفیسرز کی خدمات لی جائیں اور اردو کی کلاسیک اور جدید اردو ادب کی تحریروں کو انگریزی زبان کے قالب میں ڈھالا جائے تاکہ ہمارے ادیب انگریزی ادب پڑھنے والوں کے لیے اجنبی نہ رہیں۔ جیسا کہ اس بار ''مین بکر انٹرنیشنل پرائز'' کی جیوری نے کیا ہے کہ اس بار فہرست میں موجودہ زیادہ تر ادیب انگریزی زبان و ادب کے قاری کے لیے بالکل نئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ادیبوں کا کام انگریزی زبان میں ڈھل کر جب انگریزی ادب کے قاری تک پہنچے گا تو ہر برس عالمی سطح کے ادبی بورڈز کی لسٹ میں پاکستان کا نام بھی شامل ہوگا۔

پروفیسر ڈاکٹر فرانسس ڈبلیو پریچٹ (Francis w.Prichett) کولمبیا یونیورسٹی میں ایشیائی زبانوں کے استاد ہیں۔ انھوں نے ۱۹۹۵ء میں انتظار حسین کے ناول ''بستی'' کو انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ یوں اردو زبان کا ایک باکمال ناول خوبصورت انگریزی میں ڈھل کر دنیا بھر کے انگریزی ادب کے قارئین تک پہنچا۔ ہم تو پروفیسر فرانسس کے شکرگزار ہیں جنھوں نے یہ کام کیا۔ وہ آج کل غالب کی شعری کاوشوں پر تحقیق اور تدوین کے کام میں مصروف ہیں۔ اردو زبان میں ایسا قابل قدر کام کرنے والے غیر ملکی پروفیسرز کو سرکاری سطح پر پاکستان بلانا چاہیے اور ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اس مرتبہ مذکورہ ایوارڈ پانے والی خوش نصیب یونیورسٹی ایٹ البانے نیو یارک کی پروفیسر لیڈیا ڈیوس ہیں جو تخلیقی نثر نگاری کی استاد ہیں۔ لیڈیا ڈیوس مختصر ترین افسانہ نگاری کی بنا پر امریکی ادبی حلقوں میں ایک الگ پہچان رکھتی ہیں۔ (بشکریہ: روزنامہ دنیا)

تجمل شاہ

سید ضمیر جعفری

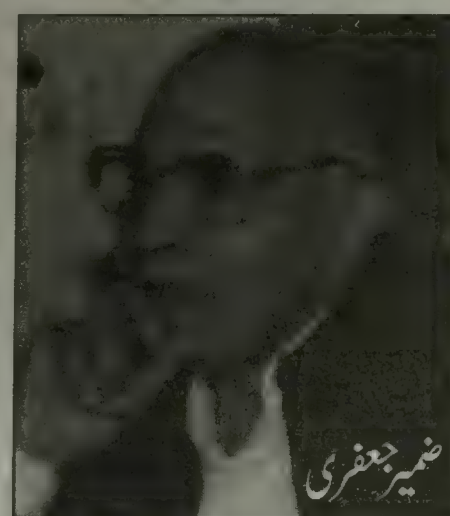
غرّاتی ہے بیوی کہ غرارا مجھے لا دو
گوٹا نہیں ملتا تو کنارا مجھے لا دو

ظرافت نگاری سے فضا کو نمکین بنانے والے ضمیر جعفری آج ہم میں نہیں لیکن ان کا فن آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ ضمیر جعفری نے مزاحیہ شاعری کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شاعری بھی کی ہے۔ وہ بیک وقت فوجی بھی تھے، صحافی بھی اور شاعر بھی۔ ان کے کئی ملی نغمے اب بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں بلکہ ان کا لکھا ہوا نغمہ ''میرا لونگ گواچہ'' مسرت نذیر کی آواز میں جب سماعتوں سے ٹکراتا ہے تو جعفری صاحب کی شخصیت بے ساختہ سامنے گھومتی نظر آتی ہے۔ سید ضمیر جعفری کا اصل نام سید ضمیر حسین شاہ ہے۔ وہ ضلع جہلم کے گاؤں چک عبدالخالق میں یکم جنوری ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گاؤں کے ٹاٹ مدرسہ میں حاصل کی۔ بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ زمانہ طالب علمی سے لکھنے کا آغاز کیا۔ لاہور سے روزنامہ ''احسان'' کے ذریعے صحافت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ چراغ حسن حسرت کے رسالے ''شیرازہ'' کے مدیر بھی رہے بعدازاں سرکاری ملازمت کے بعد فوج کے تعلقات عامہ کے شعبے سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں فوجی ملازمت کو خیرباد کہہ کر ''بادشمال'' کے نام سے اپنا روزنامہ جاری کر دیا جو کہ ناکام رہا پھر پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں پنجہ آزمائی کی وہ بھی ناکام رہی بعد ازاں پھر سے فوج میں واپسی ہوگئی۔ ۱۹۶۶ میں فوج سے سبکدوشی کے بعد سی ڈی اے کے تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر اور شمالی علاقہ جات کے مشیر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ وہ اکادمی ادبیات پاکستان سے بھی وابستہ رہے اور اخبارات کے لیے اور پی ٹی وی کے لیے پروگرام بھی کرتے رہے۔ انھیں ادبی خدمات کے طور پر تمغۂ قائداعظم، صدارتی تمغۂ برائے حسن کارکردگی اور ہمایوں گولڈ میڈل کے انعامات سے نوازا گیا۔ ان کی اب تک دو درجن سے زائد کتب منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں نمایاں نام یہ ہیں:

شاعری:

جزیروں کے گیت، کھلیان، ولایتی زعفران، لہو ترنگ، مسدّس بے حالی، گنر شیر خان، من میلہ، مافی الضمیر، ضمیریات، رموز وطن، من کے تار، متاع ضمیر، قریۂ جاں، نشاط تماشا وغیرہ۔

نثر:


ضمیر جعفری

ہندوستان میں دو سال، اڑتے خاکے، کتابی چہرے، جنگ کے رنگ، حفیظ نامچہ، آنریری خسر (ناولٹ)، گورے کالے سپاہی، ضمیر حاضر ضمیر غائب، خدوخال، نظر غبارے وغیرہ۔ ان کے پرستاروں میں ہر عمر کے لوگ شامل تھے اور آج بھی ان کی تحریروں کو پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے قلم سے رشتہ آخر دم تک برقرار رکھا۔ وہ مئی ۱۹۹۹ء میں طویل علالت کے بعد دارفانی سے چل بسے۔

ان کے کلام کے چند نمونے

ہاتھوں پر جو دیکھو گے تو دستانے بھی ہوں گے
شانوں پر گراں کوٹ کے کاشانے بھی ہوں گے
پتلون میں سگریٹ کے لیے خانے بھی ہوں گے
آنکھوں پر سُبک شیشے و پیمانے بھی ہوں گے

لیکن غم دوراں سے پریشاں ہے کلرکی
چہرے سے کلکروں کے نمایاں ہے کلرکی

بزدلی

اپنے سُورج پر نہ ہو جب اختیار
صبح نکلے بھی تو سمجھو شام ہے
جو مرّوت اپنی خواہش سے نہ ہو
وہ مرّوت بزدلی کا نام ہے

....

گھر ہے تھل میں زندگی جاپان کے معیار سے
خودکشی کی ہے نہایت قیمتی تلوار سے
تیل کب تھر نکلتا ہے کنوئیں کی دھار سے
آدمی عالم نہیں بنتا فقط دستار سے
زندگی اپنے کنارے کے سہارے ہی سے کر
کون آتا ہے مدد کرنے سمندر پار سے

....

غریب خانہ ہمیشہ سے جیل خانہ ہے
مرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے
الٰہی دل زار تاواں کی خیر
کہ آج ان کا ہر انداز ہٹلرانہ ہے

مسدس بدحالی

مِلوں پرمٹوں، کارخانوں کے جھگڑے
سیاست کے ''نو دولتانوں'' کے جھگڑے
زبانوں، بیانوں، ترانوں کے جھگڑے
فسانوں پہ ہم داستانوں کے جھگڑے
سرِخوان لقمہ اُٹھانے پہ جھگڑا
وہ جھگڑا کہ ہر دانے دانے پہ جھگڑا

☆☆☆☆

یہ لیڈر بیانوں میں کام آنے والے
جرائد میں شہ سرخیاں پانے والے
یہ ہر قول دے کر مُکر جانے والے
یہ ہر میز کرسی پہ مر جانے والے
بیاباں کو صحنِ چمن میں جانتے ہیں
قیادت کو خوراکِ تن جانتے ہیں

☆☆☆☆

مقاصد کو زیر و زبر کر کے لڑنا
نتائج سے قطع نظر کر کے لڑنا
سنان و تبرتیز کر کے لڑنا
اگر کر کے لڑنا، مگر کر کے لڑنا
کہیں دو وڈیرے جو لڑ بیٹھتے ہیں
تو سارے بٹیرے بگڑ بیٹھتے ہیں

☆☆☆☆

وطن کے لیے نظم کا ایک بند

اے میرے وطن، پیارے وطن!
میری ساری زرتمناؤں کے گہوارے وطن!
تیرے قدموں کے لیے
ریشمی دہلیز، آزادی کا نذرانہ لیے
(اپنے پیمانِ وفا کا رقصِ جانانہ لیے)
شعر کی نم ڈالیاں لاتا ہوں میں
بے دلی کی برف کو احساس کے شعلوں سے گرماتا ہوں میں
پھول کو کانٹے سے گزارتا ہوں میں
پاؤں کی زنجیر چھنکاتا ہوا گاتا ہوں میں

کچھ یادیں کچھ آنسو

عارفہ شمسہ

۲۷ دسمبر ۲۰۱۲ء دوپہر سروش نے آکر کہا کہ آپ کراچی جانے کی رٹ لگائے رہتی ہیں اب چلی جاؤنا، میں نہا کر کھانا کھا کر دوبارہ کمبل میں گھس گئی تھی۔ اسلام آباد کی سردی بدن میں گھستی ہے۔ مجھے تو ویسے بھی سردی بہت لگتی ہے۔ میں نے کہا، کیا کروں کراچی کے حالات کی وجہ سے وہاں کے لوگ خود ہی منع کر دیتے ہیں، ابھی انور اور نکہت کا فون آیا تھا کہ جنوری میں اطہر کی شادی ہے سوچا اس طرح جاؤں گی کہ پہلے آپا کے پاس جا کر رہوں پھر شادی اٹینڈ کر کے واپس آؤں۔ سروش کہنے لگی نہیں نہیں اطہر کی شادی میں مہینہ پڑا ہے آپ پھر چلی جانا،۔ میرا خیال ہے کہ آپ چلی ہی جائیں۔ سروش کا انداز عجب تھا۔ میں کچھ حیران ہوئی۔ اتنے میں آفرین کا فون آیا۔ آپ نے بکنگ کرائی میں گھبرا کر اٹھ گئی۔ خیر تو ہے، کیا ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ میرے موبائل پر پیغام آیا۔ "AMAN IN ICU" اُف۔۔ بلال اور سروش سمجھ گئے کہ مجھے پتہ چل گیا ہے۔ کہنے لگے ہم نے ایئرپورٹ بات کی ہے۔ ایک بجے والی پی آئی اے کی فلائیٹ تک تو ایئرپورٹ نہیں پہنچ سکتے، ڈھائی بجے ایئر بلو کی فلائیٹ جانے والی ہے۔ ابھی فوراً چلیئے۔ سیٹ ان کے پاس بھی نہیں ہے۔ وہاں جا کر کوشش کر لیں گے۔ میں ایک ہفتے سے گھبرا رہی تھی۔ دل پریشان تھا۔ آپا کی طبیعت اوپر نیچے ہو جاتی تھی۔ روزانہ فون پر بات ہوتی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے کہتیں کہ میں ٹھیک ہوں۔ کچھ دن پہلے چھوٹی آپا کو سیف نے فون کیا تھا کہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر سمیع کو لے کر نذر اور انور اور عمر فوراً پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ کمزوری ہے اور کوئی بات نہیں عمر کا تقاضا ہے۔ ڈرپ چڑھا دی گئی ہے۔ سیف نے مجھے بھی فون کیا میں نے خاص طور پر کہا کہ میں آجاتی ہوں، اس نے کہا، پریشان نہ ہوں، ڈاکٹر نے کمزوری بتائی ہے پریشان نہ ہوں، اگلے ماہ تو آپ آ ہی رہی ہیں۔۔ لیکن دل بے چین تھا دوسرے دن صبح بھی میں نے آپا سے بات کی تھی چھوٹی آپا پورے دن انکے پاس تھیں میں نے پوچھا اب کیا حال ہے، چھوٹی آپا نے کہا بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ فون پر بات میں بھی تھوڑی لکنت تھی۔ میں نے سیف سے پوچھا اس نے بھی کہا ہاں بہت کمزوری ہے۔ ویسے تو آپ کو پتا ہے شمسہ خالہ طبیعت آگے پیچھے رہتی ہے۔ اور میں بد بخت اُس بات کو سمجھ ہی نہ پائی تیسرے دن ہی پیغام آ گیا کہ میری آپا ''انتہائی نگہداشت'' کے وارڈ میں ہیں۔ اُف۔ یہ آئی سی یو وارڈ مجھے ڈس لیتا ہے۔ میری جان نکال دیتا ہے۔ نہ جانے یہ آئی سی یو میرا پیچھا کیوں کرتا ہے۔ میں آئی سی یو سے بہت گھبراتی ہوں، میں کیوں نہ سمجھی کہ مجھے آپا کے پاس فوری طور پر جانا چاہیے۔ اُف...... کیا دنیا میں پچھتاوہ کا علاج ہے۔

آفرین نے جلدی جلدی میرا لیپ ٹاپ اور دو

ہسپتال میں آپا کے سب ہی بچے، بلکہ ان کے سب جاننے والے قطار سے کھڑے تھے۔ مجھے شاید انور ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے، میں جو آئی سی یو سے گھبراتی تھی دوڑ کر اندر پہنچ گئی ICU۔ میں میری بہن، میری ماں میری آپا۔ بے ہوش تھیں۔ میں انھیں پکارتی رہی وہ نہ بولیں

جوڑے سمیٹے، بلال اپنی گاڑی پر مجھے لے کر عبدل کو ساتھ بٹھا کر نکلے۔ مجھے تو جیسے ہوش ہی نہ تھا، آفرین اور سروش نے گھر بند کیا اور ہم ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ ڈیڑھ بج چکا تھا پی آئی اے کی فلائیٹ بھی ابھی تک نہیں چلی تھی۔ لیکن اس میں کوئی سیٹ نہیں تھی۔ ایئر بلو والوں کی خوشامد کی لیکن انھوں نے بھی انکار کر دیا۔ ہر منٹ کراچی سے رابطہ تھا۔ نذر اور انور دلاسہ دے رہے تھے۔ لیکن آوازیں بتا رہی تھیں کہ خیریت نہیں ہے۔ میں نے ۷ بجے کی۔ فلائیٹ کا ٹکٹ لیا۔ اور نذر کو بتایا اس نے کہا ٹھہر جائیں ہم یہاں سے کوشس کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد نذر کے سمدھی بریگیڈیر جمشید کا فون آیا۔ خالہ آپ کہاں ہیں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ پھر ایک صاحب وردی میں آئے اور میرا ٹکٹ لے جا کر کچھ لکھوایا۔ اور مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے ایئرپورٹ پر وی آئی پی لاونج سے گزار کر پی آئی اے کی جو فلائیٹ ایک بجے جانے والی تھی۔ اس پر چڑھایا۔ دل سے جمشید میاں کے لیے دعا نکلی۔ وہ فلائیٹ مزید لیٹ اسلام آباد سے چلی۔ کراچی ایئرپورٹ پر حسبِ سابق سیما لینے آئی ہوئی تھیں۔ کیا کہوں۔ آتے جاتے وقت سیما اور سعید کی شخصیت کچھ ایسی ہے کہ بے ساختہ ان ہی کو فون کر دیتی ہوں۔ سیما کے ساتھ میں سیدھی ہسپتال پہنچی۔ درمیان میں نذر۔ انور سے پوچھتی رہی کہ صاف صاف بتادو آپا کیسی ہیں۔ دونوں نے کہا کہ بس ICU میں ہیں آپ آجائیے۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے تھے۔ ہم کو ضیا الدین ہسپتال پہنچتے پہنچتے چھ بج گئے، سامنے بلاک بی میں سیف کا گھر ہے، ہسپتال میں آپا کے سب ہی بچے، بلکہ ان کے سب جاننے والے قطار سے کھڑے تھے۔ نذر آئے۔ مجھے شاید انور ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے، میں جو آئی سی یو سے گھبراتی تھی دوڑ کر اندر پہنچ گئی ICU۔ میں میری بہن، میری ماں میری آپا۔ بے ہوش تھیں۔ میں انھیں پکارتی رہی وہ نہ بولیں۔ ڈاکٹر نے مجھے منع کیا ان سے بات نہ کریں، لیکن کیوں، وہ تو سب سن رہی تھیں مجھے کیوں منع کر دیا۔ ڈاکٹر بضد تھے از راہ کرم آپ جائیے۔ میرا دل انھیں چھوڑنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ انور، نذر، سیف، عمر، پپو، نے بھی سمجھایا گھر جائیے۔ وہاں سب کو آپ کی ضرورت ہے، دیکھیے نجمہ خالہ نے کتنی ہمت کی، حد ہوگئی آپ سے تو سب کی ہمت بندھتی ہے، لیکن میں کسی سے کیا کہتی، میں تو تتر بتر ہو چکی تھی، مجھے تو ان سے ابھی بہت سی باتیں کرنی تھیں چونکہ سب سے زیادہ تو میں ان سے باتیں کرتی تھی میری تحریروں کا وہ حوالہ تھیں۔ میں آخر پہلے کیوں نہیں آئی۔ کیوں؟؟۔۔ کیوں؟؟۔ ضیاءالدین ہسپتال آپا کے گھر کے بالکل سامنے ہے۔ سیما مجھے گھر لائیں، میں اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن جب گھر پہنچی اور بی بی کی حالت دیکھی تو ہمیشہ کی طرح اپنے کو سنبھالا۔ ایک دفعہ پھر میں پتھر کی بن گئی، بی بی کو جھوٹی تسلی دی۔ رات تک وہی کیفیت تھی۔ نذر۔ انور اور بی بی کو گھر بھیجا۔ صبح سے وہ لوگ ہسپتال میں تھے۔ سیف کو زبردستی رات ایک بجے لٹایا۔ فون پر فون آرہے تھے۔ میں نے کہا سیف فون ہمیں دے دو تم تھوڑا سوجاؤ۔ عمیر اور اس کے دوست ہسپتال میں تھے۔ ڈھائی بجے فون آیا۔ بینا نے اٹھایا۔ عمیر نے کہا ڈاکٹر اماں کو وینٹیلٹر پر ڈال رہے ہیں۔ حالت ٹھیک نہیں ہے۔ سیف فون کی آواز سے فوراً اٹھ کر آگئے۔ وہ پہلی رات تھی جب دسمبر میں کراچی میں تیز ہوا چلی۔ میں سیف کے ساتھ ہسپتال جانا چاہ رہی تھی۔ بینا نے منع کیا کہ آپ بچوں کے پاس رہیں میں اور سیف جاتے ہیں۔ انور اور نذر کو

فون کردیا گیا۔ میرا دل وینٹیلٹر کے لیے نہیں مان رہا تھا لیکن میں تو بہن تھی۔ بچے چاہ رہے تھے۔ ویسے بھی ڈاکٹر نے تو پہلے ہی وینٹیلیٹر پر ڈال دیا تھا، جمعہ کا دن تھا۔ پورے دن جس کو پتہ چلا ہسپتال آتا رہا، شام جب میں اور نکہت گئے، دونوں صرف ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا ڈاکٹر نے تسلی کے لیے وینٹیلیٹر لگایا ہوا ہے،، سب بچوں کو ڈاکٹر نے بلایا اور کہا کوئی صورتحال قابو میں نہیں ہے۔ متفقہ فیصلہ سے وینٹیلیٹر ہٹایا گیا۔ جیسے ہی وہ ہٹا۔ آپا ہم سب سے رخصت ہوگئیں۔

میری آپا۔ میں نے آپ کو کتنا تنگ کیا ہے۔ کتنا پریشان کیا ہے۔ میں نے کبھی آپ کو بے حس کہا تو کبھی کہا آپ انسان نہیں، نہ جانے آپ کس مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔ ہمیشہ لڑتی رہی جھگڑتی رہی۔ ایک فرشتہ آپ کی صورت میں ہمارے درمیاں اتنے دن تک رہا۔ جس کی ہم نے قدر نہ کی، یہ ان کی نہیں میری بدقسمتی تھی ہماری بدقسمتی تھی، بھلا کہاں کسی کو ایسے ایسے مواقع ملتے ہیں۔ ایک ایسی فرشتہ صفت عورت، جب بچے چھوٹے تھے تو صبح اٹھتی فجر کی نماز پڑھنے کی بعد گھر کا کام جوان کی دیورانی زاہدہ آپا اور ان کے درمیان بٹا ہوا تھا، کرتیں۔ کپڑے سیتی۔ شام کی روٹی پکاتی۔ بچوں کے کاموں کے ساتھ ساتھ سب کا خیال رکھتیں۔ معین بھائی (آپا کے دیور) کے انتقال کے بعد سب ساتھ تھے۔ مجال تھی جو بچوں میں تفریق کی ہو، وہ بغیر ساس کے اپنے شوہر کے ساتھ بھی کبھی نہیں گئیں۔ جوانی میں بھی جب دولہا بھائی نے کہیں جانے کو کہا تو اپنی ساس کو ساتھ لیا، ساس بھی بہت چاہتی تھی۔ دونوں نندیں سردار آپا اور سلطان آپا کی چہیتی تھیں۔ ان کے بچوں کی ہردلعزیز مامی۔ کسی کے ہاں بچہ ہورہا ہے تو ہسپتال میں ساتھ جارہی ہیں، خاندان میں نہ جانے کتنی شادیاں ان کے گھر سے ہوتی تھیں کسی کی بَری بن رہی ہے تو کسی کا جہیز، ہر ایک کے کپڑے سینے کی ذمہ داری۔ میکہ اور سسرال کے جتنے لوگ ہندوستان سے آتے آپا کا گھر ہمیشہ کھلا رہتا۔ سب ان کے ہاں ہی ٹھہرتے تھے۔ دولہا بھائی نے تو اپنے گھر میں اپنے ماموں اور ان کے بچوں کے لیے کمرے بھی بنادیے تھے۔ سب کے بچوں کو سلائی سکھائی، نور محمد بھائی کو وہ اور دولہا بھائی کانپور سے ساتھ لائی تھیں۔ ان کی شادی کی، پھر بچوں کو اپنے بچوں کے ساتھ پالا۔

مجھے نہیں یاد کہ کبھی نماز چھوڑی یا روزے چھوڑے ہوں دعاؤں میں بچوں کے لیے گڑگڑاتے ہوئے میں نے دیکھا۔ مجھے اور رضوان کو بھی انھوں نے ہی پالا۔ میں سب سے بدتمیز تھی۔ مجھے ان کی بے حسی بری لگتی تھی۔ کبھی میاں سے بھی فرمائش نہ کی، مجھے ان کی سادگی، ان کی معصومیت ایک آنکھ نہ بھاتی۔ ہر بات پر ان سے لڑتی تھی۔ مجھے بھی کچھ نہ کہتیں۔ دوسروں سے کہتیں اسے سمجھاؤ۔ اپنے دولہا بھائی سے بدتمیزی نہ کرے۔ آپا آپ کیسی تھیں۔ آپ نے تو صرف محبت کرنا سیکھی تھی۔ صرف محبت۔ آپ نے اپنے شوہر کی کس قدر خدمت کی۔ آپ نے عام ماؤں کی طرح ممتا کا واویلہ نہیں مچایا۔ آپ کی اکلوتی بیٹی پروین آپ کے لیے روتی تھی کہ آپ میرے پاس کیوں نہیں رہتیں۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آپ اُسے چاہتی نہیں تھیں۔ بیوقوف لڑکی، کس قدر پاگل ہے وہ اپنی محبت کی خاطر سمجھتی تھی کے شاید ماں اس سے محبت نہیں کرتیں، ارے اس کی ماں کو ان کے میاں نے اپنی دانست میں ایک ٹھکانہ دیا تھا ایک چھت دی تھی جوان کا اپنا تھا، جہاں ان کا بستر تھا۔ ان کا کمرہ تھا۔ الماری تھی۔ اس کمرے میں انھوں نے

ایسا لگ رہا تھا کہ آپا کو تسلی کے لیے وینٹیلٹر لگایا ہوا ہے، سب بچوں کو ڈاکٹر نے بلایا اور کہا صورتحال قابو میں نہیں ہے۔ متفقہ فیصلہ سے وینٹیلٹر ہٹایا گیا۔ جیسے ہی وہ ہٹا۔ آپا ہم سب سے رخصت ہوگئیں

اپنے شوہر کی خدمت کی تھی۔ وہ ہر پھر کر صرف اسی جگہ رہنا چاہتی تھیں۔ اس جگہ کی ان کے اندر لمبی داستان تھی صدر کے بچوں عزیر اور عمر کو اس طرح سلاتی تھیں اور خود باہر بیٹھتی تھیں کہ زور سے نہ بولنا اندر (عزیر سو رہا ہے)۔ میں چڑ جاتی آپ کیسی عورت ہیں۔ خود بھی تو آرام کرلیا کریں۔ مجھے خاموش رہنے کا کہتیں۔ وہ جگہ۔ وہ کمرہ۔

ماشاءاللہ جوان پوتے پوتیوں والی دادی جو سب انکو اماں کہتے تھے۔ ایک لڑکی کے ساتھ تھیں۔ جو خدمت گار تھی۔ سیف کی صبح ماں کے ساتھ ہوتی وہ اخبار سناتا۔ پھر ناشتا کراتا۔ شام کو آکر ماں کے پاس بیٹھتا رات کو اٹھ کر بھی کئی پھیرے لگاتا۔ یہ ہی ان کی زندگی کی خوشی تھی۔ بی بی کی تڑپ۔ نذر، انور، سیف، پپو، فرح، سیما، بابو جی سب نوحہ خواں ہیں۔ ایک سال قبل بڑا بیٹا سب کا چہیتا صدر الاسلام ان سے جدا ہوگیا۔ اس کا غم انھیں نڈھال کرگیا۔ لوگ کہتے ہیں ماشاء اللہ ۸۶ سال کی تھیں۔۔۔ کیا ممتا کے لئے عمر ضروری ہوتی ہے۔ ۱۰۰ سال کی مائیں بھی اپنے بچوں کے پوتا پوتی، نواسا نواسی کے ارد گرد ایسے رہتی ہیں جیسے پھولوں بھری پریاں۔ ہم اسی میں خوش ہیں کہ انھوں نے ماشاءاللہ ہمارے ساتھ عمر کے ۸۶ سال گزارے۔ وہ زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ ہسپتال گئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ خدمت کا موقع نہ دیا۔

آپا آپ مجھے بہت اکیلا کرگئیں۔ اللہ چھوٹی آپا کو زندہ سلامت رکھے۔ وہ تو ذہنی طور پر پریشان ہوگئی ہیں، شائد وہ کھل کر رولیتیں تو اتنی پریشان نہ رہتیں۔ باتیں ہی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ میں نالائق ان سے بھی لڑتی رہتی ہوں چونکہ وہ کبھی کبھی بلا سوچے سمجھے بولتی ہیں، لیکن مجھے خود ہی خیال آجاتا ہے کے وہ جان کر نہیں بولتیں۔ اپنی محبت سے مجبور ہیں، ہم سب کو اب انہیں اسی طرح ہاتھوں ہاتھ رکھنا ہے، کسی کو چاہنے کے لیے اپنی مرضی کا ہونا ضروری نہیں، رشتوں میں، دوستی میں صرف چاہت ہوتی ہے، جو جیسا ہو ہمیں اسے ویسے ہی قبول کرنا پڑتا ہے۔

اللہ عمر، سدرہ اور اریبہ کو سلامت رکھے جس نے انہیں بھلایا ہوا ہے، یہ ہم کو بہت عزیز ہیں۔ سدرہ نے تو آپا کی بھی خدمت کی ہے۔

اللہ رضوان کو صحت وسلامتی کے ساتھ رعنا اور بچوں کے سر پر قائم رکھے (آمین) وہ ہم سب کی خاطر پاکستان کا چکر لگاتا ہے، اللہ میری آپا کے درجات بلند کرے،، میری آپا میرے دل کی پیاری...... مجھے بھی بلالیں اپنے پاس، اس بے ثباتی دنیا سے دل گھبرا گیا ہے، دل بے چین ہے معلوم نہیں کیوں۔ دل ماہی بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں۔

آپا کے جانے کے بعد آج پہلی مرتبہ کچھ لکھا ہے، ہر نماز کے بعد انکے بچوں کے لیے بھی دعا کرتی ہوں، جو آپا کے دل کا ٹکڑا ہیں رضوان اپنے گھمبیر مسئلوں میں الجھا ہوا ہے، اللہ اسے سکون واطمینان دے (آمین)

چھوٹی آپا کی بے چینی بڑھ گئی ہے۔ میرا اضطراب بڑھ گیا ہے۔ میں تو خود پر قابو پا کر دنیاداری میں مصروف رہنے کی کوشش میں ہوں۔

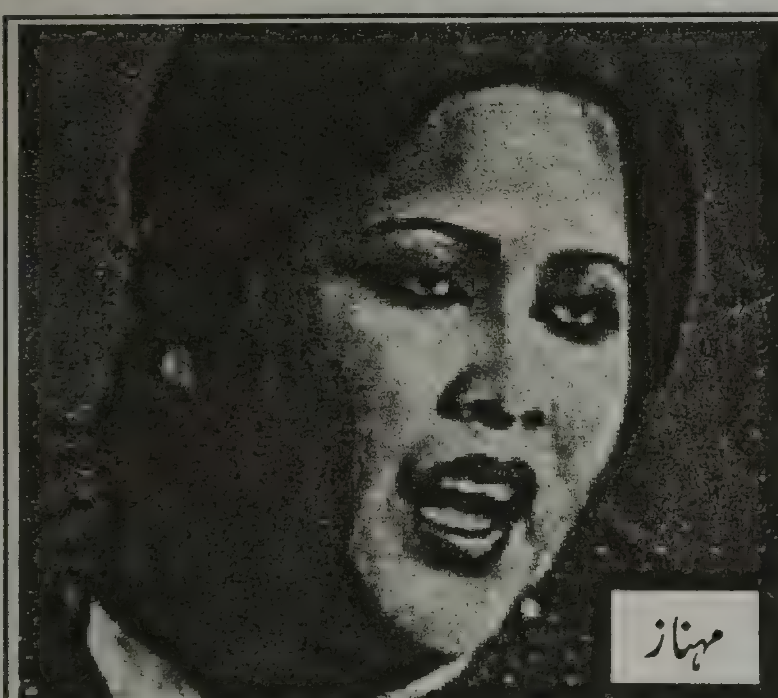
اللہ چھوٹی آپا کو بھی صبر دے ان کا بہت بڑا آسرا تھیں۔ کاش میری آپا میرے پاس ہوتیں۔ میں روزانہ ان کو تیار کرتی، وہ آپا جو ہر ایک کو چاہتی تھیں۔ وہ تو ہمیشہ دوست دشمن کی تمیز نہ کر پائیں۔ ہر ایک کے لیے بھی دعا گو رہیں، صحت کے لیے دعائیں کیں، گلے لگایا، پھر بھی سب کہتے تھے اماں کو تو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا، پتا نہیں بے چاری کو کیا کرنا چاہیے تھا، چلو اچھا ہوا چلی گئیں بس ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔

☆☆☆

نجم آرا

مہناز......اک دلنواز آواز

مہناز نے تقریباً تین دہائیوں تک عالمی سطح پر اپنا جادو جگائے رکھا اور اچھے اخلاق اور کردار سے نمایاں رہیں۔ مہناز مجھ سے جونیئر تھیں۔ میں نے گلے کی خرابی کے سبب ریڈیو جانا بہت کم کر دیا تھا پھر بھی اچانک سلیم گیلانی سے ملاقات کے دوران مہناز کا ذکر آیا۔ انھوں نے مجھے مہناز کا ایک گیت جس کی کمپوزیشن مہدی حسن صاحب کے بڑے بھائی نے کی تھی، سنوایا اور میں نے محسوس کیا کہ ایک بے حد سریلی آواز کا اضافہ ہوگیا۔ مہناز نے اپنی ہم عصروں میں نمایاں مقام ٹھمری اور دادرا گانے سے حاصل کیا۔ جو انھوں نے والدہ کجن بیگم سے سیکھا تھا۔ ان کے والد سید اختر وصی علی اور والدہ کجن بیگم ریڈیو کے سینئر فنکار تھے اور مہناز کو بھی سریلا پن ورثہ میں ملا۔ مہناز کی خالہ شمیم بانو سے میرے دیرینہ مراسم ہیں وہ بھی بہت اچھی گلوکارہ ہیں مگر انقلاب موسیقی کے سبب خاموش ہیں۔ ان کے شوہر سید تراب نقوی مرحوم ہی مہناز کو ریڈیو پر لے کے گئے تھے۔ وہ خود بھی پروگرام منیجر تھے اور زندگی بھر مہناز کے معاون رہے۔ مہناز نے تقریباً ۲۵۰۰ گانے ریڈیو اور ٹی وی کے لیے گائے جن میں زیادہ تر مشہور ہوئے اور خصوصاً مسرور انور مرحوم کا خوشبو فلم کے لیے لکھا ہوا گانا (میں جس دن بھلا دوں ترا پیار دل سے) بے حد مقبول ہوا۔



مہناز

ریڈیو پر احمد فراز کی غزل (اب کہ تجدید وفا) اور ضیا جالندھری کی غزل (رنگ باتیں کریں) بے حد مقبول ہوئیں۔ مہناز ۴ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ بھائی سب امریکہ میں مقیم ہیں وہ کراچی اپنی خالہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کی خالہ شمیم بانو نے ان کا بالکل والدہ کی طرح خیال رکھا۔ اسی لیے کراچی سے امریکہ کے لیے آمدورفت جاری رہتی تھی۔ کافی عرصہ سے علیل تھیں مگر بہادری سے بیماری کا مقابلہ کرتی رہیں۔ اپنی ذات سے لاپروائی کو اپنا شعار بنالیا تھا اور بدپرہیزی کی انتہا نے اس کی جان لے لی۔ ویسے بھی اب ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام تو برائے نام رہ گئے تھے اور یہ بات اس فنکار کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے جو بہت زیادہ مصروف رہا ہو۔ بیرون ملک ان کے پروگراموں کی بے حد پذیرائی ہوتی تھی۔ کاش کہ یہ تعریفی الفاظ میں ان کی زندگی میں لکھتی مگر کیا کیا جائے۔ بعداز مرگ واویلا کی ہمارے یہاں رسم چلی آ رہی ہے۔ بڑے بڑے عظیم فنکاروں کی موت کے بعد ان کی خوبیوں کا پتہ چلتا ہے۔ دعا ہے کہ قابل قدر فنکاروں کی زندگی میں قدر کی جائے اور ان کی ہمت افزائی کی جائے اور ان کی موت کا انتظار نہ کیا جائے۔ آخر میں مہناز کے لیے دعا مغفرت کرتی ہوں۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے اور سب اہل خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے! مہناز کی موت واقعی دنیائے موسیقی میں بہت بڑا خلا چھوڑ گئی ہے اور ہم لوگ ایک انتہائی سریلی آواز سے محروم ہو گئے۔ ☆☆☆☆☆


روح افزا
رمضان مبارک
رحمت برکت جمع کرو...
اور کیا چاہیئے!
ہمدرد
Brands of the year Award
SGS
SGS
Pakistan Standards

اردو زبان دو تہذیبوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی

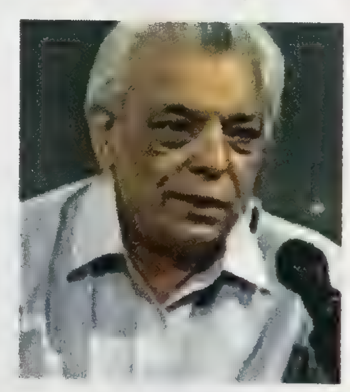


پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے کہا ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ یہ زبان دو تہذیبوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی، اردو کے آغاز وارتقاء کی ایک دلچسپ کہانی ہے لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اردو نے بڑی تیزی سے عوامی قبولیت حاصل کی۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے الخیر یونیورسٹی بھمبر میں ایم فل اردو کے طلبہ وطالبات سے ''اردو زبان کے آغاز'' کے موضوع پر خصوصی لیکچر دیتے ہوئے کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو لشکر میں پیدا ہوئی۔ اس میں دہلی کے اردگرد کی کئی بولیاں شامل ہیں۔ برج بھاشا اور پنجابی اس کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ اپنے لیکچر میں انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد، سید سلیمان ندوی، نصیر الدین ہاشمی، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری اور عین الحق فرید کوٹی سمیت دیگر محققین کا ذکر کیا اور اردو زبان کے ارتقائی مراحل کو تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سید سلیمان ندوی نے اپنی معروف تصنیف ''نقوشِ سلیمانی'' میں لکھا ہے کہ اردو کا اصل مولد سندھ ہے اور اس کا ہیولا اسی وادی میں تیار ہوا۔

ممتاز شاعر اور نغمہ نگار ریاض الرحمٰن ساغر کا انتقال

ممتاز شاعر، نغمہ نگار اور ادیب ریاض الرحمٰن ساغر طویل علالت کے بعد



لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔ ریاض الرحمٰن ساغر نے متعدد فلموں کے لیے ۲۰ ہزار سے زائد نغمات لکھے۔ وہ ایک عرصہ سے نوائے وقت کے لیے تاثراتی نظمیں لکھ رہے تھے۔

بلال محمود کو صدمہ

ادارہ فروغ قومی زبان کے کارکن بلال محمود کے والد انتقال کر گئے ہیں۔ ادارہ کے ایگزیکٹوڈائریکٹر، افسران وعملہ نے ان سے تعزیت کا اظہار کیا ہے اور دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت اور لواحقین کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔



محمد نعیم کی الوداعی تقریب میں سٹیج پر دائیں سے صاحب تقریب، محمد بلال، مشہود مرزا اور انتخاب عالم



محمد نعیم کے اعزاز میں الوداعی تقریب

ادارے میں کام کرنے والے سب کارکن اپنے کام کی نوعیت کے اعتبار سے اہم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات چھوٹے گریڈ کے کارکن اپنے مزاج اور محنت کی وجہ سے احترام اور عزت میں دوسروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ یہ بات وزارت اطلاعات ونشریات وقومی ورثہ کے جائنٹ سیکریٹری اور ادارہ فروغ قومی زبان کے ایگزیکٹوڈائریکٹر محمد بلال نے ادارہ فروغ قومی زبان کے کارکن (مالی) محمد نعیم کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر دفتر کے افسران وعملہ کی طرف سے دی گئی الوداعی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ محمد نعیم اپنے دھیمے مزاج اور انتھک محنت کی وجہ سے اس ادارے میں مختصر قیام کے باوجود اپنا بڑا مقام بنا گئے۔ محمد نعیم کو یہاں کے لوگ اور دفتر کے گل وگلزار بہت دیر تک یاد رکھیں گے۔ ایگزیکٹوڈائریکٹر محمد بلال نے کہا کہ چند ماہ قبل ادارہ مالی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکا تھا لیکن اچھے نظم ونسق اور گڈ گورننس کی وجہ سے اب ادارہ مالی مشکلات پر قابو پا چکا ہے۔ تقریب میں وزارت کے جائنٹ سیکریٹری ایڈمن مشہود مرزا اور ڈپٹی سیکریٹری انتخاب عالم نے بھی شرکت کی۔ انھوں نے بھی محمد نعیم جیسے کارکنوں کو اداروں کا سرمایہ قرار دیا۔ ریٹائر ہونے والے کارکن (مالی) محمد نعیم نے ادارے کے افسران اور عملے کا شکریہ ادا کیا اور اس ادارے میں اپنے قیام کو زندگی کے اچھے دنوں سے تعبیر کیا۔ تقریب کے اختتام پر محمد نعیم کو تحائف بھی پیش کیے گئے۔



مالی کے لیے پھولوں سے بہتر کوئی تحفہ نہیں، ایگزیکٹوڈائریکٹر محمد بلال محمد نعیم کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے

ٹورانٹو میں ''ایشین ہیری ٹیج فیملی ڈے'' کا انعقاد

ٹورانٹو مغرب کا وہ واحد ملک ہے جہاں دنیا بھر سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کو بلاتفریقِ رنگ ونسل، زبان ومذہب برابر کے حقوق، مراعات اور تحفظ دیا جاتا ہے۔ انہیں اپنی تہذیب، ثقافت، عقیدے اور اقدار کا پرچار کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایشین ہیری ٹیج فیملی ڈے کا منانا ہے۔ اس سال تھورنک لیف نیبر ہڈ آفس کی جانب سے مقامی لائبریری کی سماعت گاہ میں تمام ساؤتھ ایشین کمیونٹیز نے مل جل کر اپنی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا شاندار، بھرپور اور پر جوش مظاہرہ کیا۔ جس میں فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں کی صنعت گری، گلوکاری، رقص، کھیل وذہنی آزمائش، اداکاری وفنِ خطابت کے ساتھ ساتھ علمی وادبی حوالوں سے منتخب اردو شاعری سنوا کر حسنِ ذوق رکھنے والوں کی دل بستگی کا سامان بھی کیا گیا۔ ساؤتھ ایشین کمیونٹی کی اس نمائندہ تقریب کے مہمانِ خصوصی فنونِ لطیفہ کے ادبی اسکالر تسلیم الٰہی زلفی تھے۔ جن کی آمد پر انہیں ''ایشین ہیری ٹیج فیملی ڈے چیف گیسٹ ایوارڈ'' ان کی نذر کیا گیا۔ مہمانِ خصوصی کے علاوہ کمیونٹی کی معروف شخصیات، محمد ندیم، مظہر شفیق اور احتشام عظیمی کی شرکت اور ولولہ انگیز خطاب نے تقریب کی رونق بڑھادی۔ اس کامیاب تقریب کے انعقاد کے لئے عائشہ فردوس، مہتاب ساجد، ثروت مہوش، رافعہ اور کوثر ارشد قابلِ مبارکباد ہیں جن کی روز وشب کی محنتوں اور کوششوں کے نتیجے میں تھورنک لیف ٹورانٹو کے باسیوں کو ایک یادگار اور دھنک رنگ دن ملا۔

رپورٹ: احتشام عظیمی۔ ٹورانٹو



ٹورانٹو، ثقافتی تقریب میں ایشیائی باشندوں کی شرکت



البصیرہ کے زیر اہتمام ''اجتہاد میں زمان و مکاں کی حیثیت'' سیمینار سے ڈاکٹر قبلہ ایاز، محمد بلال، ڈاکٹر انیس احمد، استاد ثاقب اکبر، ڈاکٹر جمیل قلندر، ڈاکٹر رشید احمد، مفتی گلزار احمد نعیمی، ڈاکٹر محمد طفیل، علامہ مزمل حسین اور دیگر مقررین خطاب کر رہے ہیں

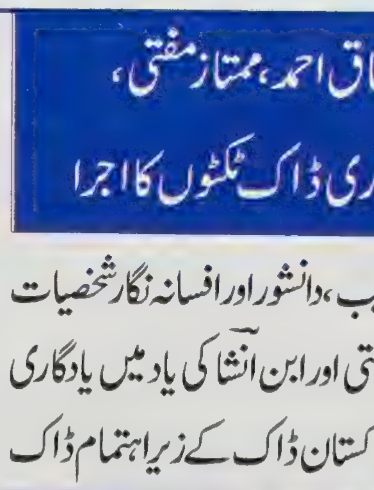
البصیرہ کے زیر اہتمام ادارہ فروغ قومی زبان میں امام خمینی کی برسی کے حوالے سے سیمینار

پاکستان کے نظام تعلیم میں بھی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ آئندہ برس جب امریکی افواج افغانستان سے نکلیں گی تو پاکستان افغانستان اور خطے کو ممکنہ طور پر جو مشکلات پیش آسکتی ہیں اس کے حوالے سے ابھی سے ملک کے اہل علم طبقہ کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار پشاور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر قبلہ ایاز نے ادارہ فروغ قومی زبان میں علمی و تحقیقی ادارے البصیرہ کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار میں کیا، یہ سیمینار امام خمینی کی چوبیسویں برسی کے موقع پر منعقد کیا گیا۔ سیمینار کا عنوان تھا'' اجتہاد میں زمان و مکاں کی حیثیت اسلامی مفکرین کی آراء کی روشنی میں''۔ ادارہ فروغ قومی زبان کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر محمد بلال کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو زبوں حالی سے نکالنے کے لیے اجتہادی بصیرت سے کام لینا چاہیے۔ ستاون اسلامی ممالک کو امت کے مسائل کے حل کے لیے آپس میں متحد ہونا چاہیے۔ اہلِ علم و فکر نے ہر دور میں بدلتے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن مجید کے فلسفے اور تعلیمات اسوۂ رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کے اعمال صالحہ کے مطابق زندگی کی ایسی راہیں متعین کیں جو امت مسلمہ کی انفرادی اور اجتماعی معاشرتی زندگی کے لیے مشعل راہ بنیں۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال نے اتحاد اور اجتہاد کا پیغام دیا ہے۔ رفاہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر انیس احمد نے کہا کہ شریعت کا اصل مصدر قرآن و سنت ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں البتہ ان کے فہم میں مختلف آراء ہو سکتی ہیں ہمیں اختلاف آراء کا احترام کرنا چاہیے۔ صدر نشین البصیرہ ثاقب اکبر نے کہا کہ علامہ اقبال اور امام خمینی کے متحرک اجتہاد کے نظریے کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ برصغیر میں شاہ ولی اللہ نے جرأت مندانہ فقہی نظریات پیش کیے۔ عالمی سطح پر اسلام کو متعارف کروانے کے لیے ضروری ہے کہ دین کے آفاقی پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر جمیل قلندر نے کہا کہ رب العالمین نے قرآن کو عالمین کے لیے ذکر اور اپنے رسول کو عالمین کے لیے رحمت قرار دیا ہے۔ انہیں سمجھنے اور جاننے کے لیے عمیق فکر اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ تقریب میں ڈاکٹر محمد طفیل، ڈاکٹر رشید احمد اسسٹنٹ پروفیسر پشاور یونیورسٹی، مفتی گلزار احمد نعیمی مہتمم دارالعلوم جامعہ نعیمیہ، علامہ مزمل حسین نقوی ڈائریکٹر ریسرچ البصیرہ کے علاوہ دیگر کئی مقررین نے سیمینار پر تحقیقی مقالات پیش کیے۔ علماء، دانشوروں اور اہلِ علم کی کثیر تعداد کے علاوہ سیمینار میں اسلامی جمہوریہ ایران کے نائب سفیر حسین روش، ثقافتی نمائندے علی دوستی اور خانہ فرہنگ راولپنڈی کے ڈائرکٹر جنرل محمد اکبری نے بھی شرکت کی۔

قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، اور ابن انشا، کی یاد میں یادگاری ڈاک ٹکٹوں کا اجرا

پاکستان پوسٹ نے ملک کے ممتاز ادیب، دانشور اور افسانہ نگار شخصیات قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، ممتاز مفتی اور ابن انشا کی یاد میں یادگاری ٹکٹ جاری کیے ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان ڈاک کے زیر اہتمام ڈاک ٹکٹوں کے اجرا کی ایک تقریب منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی ڈی جی پاکستان پوسٹ سید غلام پنجتن رضوی تھے۔ فاطمہ جناح یونیورسٹی کی وائس چانسلر اور قدرت اللہ شہاب کی بھانجی ڈاکٹر ثمینہ امین قادر، عائشہ مسعود، حمید شاہد، جلیل عالی اور عکسی مفتی نے اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے علم و ادب و فلسفہ کی ان اہم شخصیات کے حالات زندگی، ادبی خدمات اور تصوف سے وابستگی پر سیر حاصل گفتگو کی۔

ممتاز صحافی، شاعر و ادیب انوار فیروز کا انتقال



ممتاز صحافی، کالم نگار، کہنہ مشق شاعر اور ادیب انوار فیروز منگل ۲/ جولائی ۲۰۱۳ء کو دل کا دورہ پڑنے سے ۷۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کے سوگوار لواحقین میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ انوار فیروز کا صحافتی سفر پچاس سال سے زائد عرصہ پر محیط تھا۔ وہ روزنامہ تعمیر کے چیف رپورٹر رہے۔ جہاں راہی کے نام سے ان کا مختصر کالم بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ وہ انگریزی اخبار نیو ٹائمز راولپنڈی اور ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے۔ روزنامہ نوائے وقت سے ان کی وابستگی گزشتہ ۳۵ سال سے زائد رہی۔ وہ حلقہ ارباب ذوق اور دیگر ادبی تنظیموں کے روح رواں تھے، ادبی اور علمی کتابوں پر تبصرے اور کالم لکھا کرتے تھے، ان کے شعری مجموعہ ''سمندر مضطرب'' کو عوامی سطح پر زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ ملک بھر کے ادبی رسائل و جرائد میں ان کا کلام باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔



قائداعظم اکیڈمی کے زیر اہتمام قائداعظم کے حوالے سے بین الاقوامی کانفرنس میں مہمان خصوصی محمد بلال جائنٹ سیکرٹری وزارت اطلاعات ونشریات وقومی ورثہ وا یگزیکٹو ڈائریکٹر ادارہ فروغ قومی زبان کو اکیڈمی کی ڈائریکٹر ڈاکٹر شہلا کاظمی یادگاری شیلڈ پیش کر رہی ہیں۔

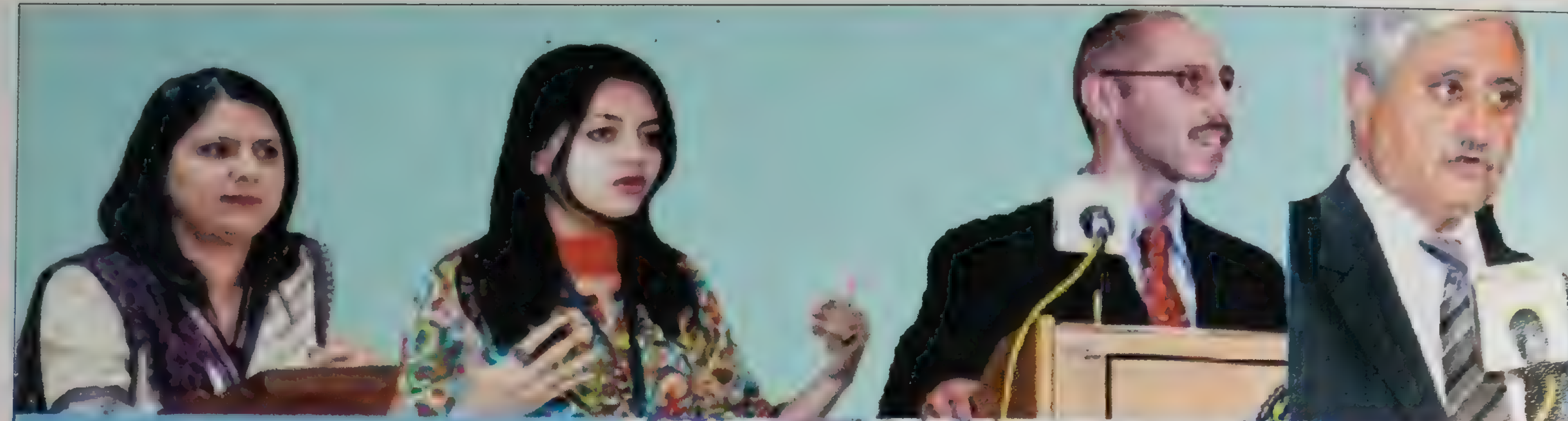


قائداعظم اکیڈمی کراچی کے زیر اہتمام کانفرنس میں مہمان خصوصی محمد بلال ایگزیکٹو ڈائریکٹر ادارہ فروغ قومی زبان، پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹر فخر الاسلام کو شیلڈ پیش کر رہے ہیں

بشیر حسین ناظم کی پہلی برسی



درویش ملنگ صفت انسان بشیر حسین ناظم کو ہم سے بچھڑے ایک سال بیت گیا، وہ نہ صرف عربی زبان کے عالم فاضل تھے بلکہ فارسی، اردو اور پنجابی پر بھی بلا کی دسترس رکھتے تھے۔ علم پر دسترس کا ایک واقعہ یوں بھی ہے کہ ان کی صدارت میں ایک تقریب ہو رہی تھی کہ ایک استاد شاعر نے ایک جملہ وزن سے ہٹ کے بول دیا۔ اس پر ناظم صاحب سیخ پا ہو گئے اور احتجاجاً اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ جب تک استاد وہ لفظ صحیح تلفظ کے ساتھ ادا نہیں کریں گے وہ کرسی صدارت پر نہیں بیٹھیں گے۔ تقریب میں موجود اُن کے شاگردوں نے استاد کے حق میں بہت سی تاویلیں دیں اور احتجاج کیا لیکن ناظم صاحب اپنے مطالبے پر ڈٹے رہے اور تلفظ صحیح کر کے ہٹے۔ ناظم صاحب پہلے جتنے سخت گیر تھے زندگی کے آخری عرصے میں وہ اتنے ہی نرم دل واقع ہوئے۔ جس سے بھی ملتے انتہائی انکساری، عاجزی ان کے ہاں پائی جاتی۔ سلام کے بعد ہاتھ چومتے۔ تسبیح ان کے ہاتھ میں ہوتی اور درود شریف کا ورد ان کی زبان پر جاری رہتا۔ ہمارے ہاں اخبار اردو میں آتے ہی سلام کے بعد نعرہ بلند کرتے یا پیر کیا حال ہے، یہی رویہ تمام دوست احباب سے بھی دیکھا گیا۔ علمی و ادبی تقریب میں جو کوئی بھی بلاتا وہ چلے آتے مگر اِس کے برعکس اُن کی برسی کے موقع پر کسی ادبی تنظیم نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے انہیں یاد نہیں کیا۔ وہ اس ادارے اور اخبار اردو سے مسلسل رابطے میں رہے۔ ادارہ ان کی ادبی و علمی خدمات کے حوالے سے ان کی پہلی برسی پر انہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔



زبان حصول علم میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے

جامعہ آزاد کشمیر میں لسانیات کانفرنس سے صدر آزاد کشمیر اور دیگر مقررین کا اظہار خیال



اقائی زبانوں کے تحفظ اور ان کے فروغ کے لیے پہلی دو روزہ کشمیر
الاقوامی لسانیات کانفرنس آزاد جموں و کشمیر یونیورسٹی میں منعقد
ئی۔ کانفرنس کا بنیادی مقصد ایشیا بالخصوص کشمیر میں بولی جانے والی
ں کے مخدوش مستقبل اور ان کو محفوظ کرنے اور فروغ دینے کے
اقدامات تجویز کرنا تھا۔ پہلی کشمیر بین الاقوامی لسانیات کانفرنس
سے زائد ملکی اور بڑی تعداد میں غیر ملکی ماہرین لسانیات نے
کی۔ کانفرنس کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے
زاد کشمیر/ چانسلر جامعہ کشمیر سردار محمد یعقوب خان نے کہا کہ
میں زوال پذیر زبانوں کی حفاظت کے حوالے سے یہ کانفرنس
نتائج مرتب کرے گی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے یونیورسٹی
تر تحقیقی و تدریسی ماحول کی ترویج و ترقی میں مدد ملے گی۔
جودہ کانفرنس کا موضوع ایک اہم موضوع ہے جس سے زبانوں
ست و ریخت اور ان کے تحفظ کے لیے مناسب انداز
میں اقدامات کرنے میں مدد ملے گی۔ کانفرنس کی افتتاحی تقریب
سے خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر جامعہ کشمیر پروفیسر ڈاکٹر سید
دلنواز احمد گردیزی نے کہا کہ یونیورسٹی نے اپنی سابقہ روایات کو
برقرار رکھتے ہوئے ایک اہم موضوع پر بین الاقوامی کانفرنس منعقد
کرانے میں کامیابی حاصل کی مجھے امید ہے کہ یہ کانفرنس کشمیر میں
بولی جانے والی مخصوص زبانوں کی انحطاط پذیری اور اسے روکنے
کے لیے مناسب اقدامات تجویز کرے گی۔ وزیر تعلیم آزاد حکومت
ریاست جموں و کشمیر مطلوب انقلابی نے کہا کہ زبان انسانی ذہانت
اور عقل و دانش کا ایک ذریعہ ہے۔ اس سے ہماری پہچان ہوتی ہے۔
یونیورسٹیاں ہمارے تھنک ٹینک ہیں۔ فاطمہ جناح یونیورسٹی کی
وائس چانسلر ثمینہ امین قادر نے کہا کہ ہمارے خطے میں بولی جانے
والی زبانوں کو جو مسائل درپیش ہیں اس کانفرنس کے ذریعے ان
سے نمٹنے میں مدد ملے گی۔ ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں پر
بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں جو ہماری ثقافت کے وسیع ہونے کا
ثبوت ہے۔ اس موقع پر ڈین فیکلٹی آف آرٹس آزاد جموں و کشمیر
یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر راجہ نسیم اختر نے کہا کہ پاکستان میں لسانیات
کے فروغ پر توجہ نہ دینا قابل افسوس ہے۔ زبان صرف رابطے کا نام
نہیں ہوتی بلکہ زبان حصول علم میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔
زبانیں جس تیزی سے متروک ہوتی جا رہی ہیں وہ باعث تشویش
ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں تقریباً ۷۲ زبانیں بولی جاتی
ہیں جن میں سے صرف پانچ سے سات زبانیں ہی مستحکم ہیں۔
پاکستان میں بہت ساری بولی جانے والی زبانوں کو خطرات لاحق
ہیں، مستقبل میں خدشہ ہے کہ ان زبانوں کا وجود ہی ختم نہ ہو جائے۔
کسی زبان کا خاتمہ ورثے کا خاتمہ ہوتا ہے، زبان کا معاشرے کے
ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد بھی مختلف زبانوں کو
لاحق خطرات کا اجاگر کرنا اور ان خطرات کے حل کے لیے کوشش کرنا
ہے۔ ڈاکٹر عائشہ سہیل نے کہا کہ یہ کانفرنس مخدوش ہونے والی جنوبی
ایشیائی زبانوں بالخصوص کشمیر کی علاقائی زبانوں کے احیاء میں مددگار
ثابت ہوگی۔ ریسرچ مقالہ جات پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر پال
کیپاسکی (امریکہ)، ڈاکٹر نکلس آسلر (برطانیہ)، ڈاکٹر اوم کارکول
(بھارت) ڈاکر وسیمہ شہزادا ئیر یونیور سنمٹنیی، ڈاکٹر مصور احمد (مقبوضہ
کشمیر)، ڈاکٹر نذیر احمد ڈار (مقبوضہ کشمیر)، ڈاکٹر عادل امین
کاک (مقبوضہ کشمیر)، نیلوفر حسین وانی (مقبوضہ کشمیر)، ڈاکٹر ثروت
رسول فاطمہ جناح یونیورسٹی، خوش دیومنی (مقبوضہ کشمیر)، ڈاکٹر سرینہ
حسین (آسٹریلیا)، ڈاکٹر طارق رحمٰن لاہور، راجہ نسیم اختر ڈین جامعہ
کشمیر، حبیب اللہ پٹھان سمیت تحقیق نگاروں نے ۹۰ سے زائد مقالہ
جات پیش کیے۔ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے چیف سیکرٹری
آزاد کشمیر علم الدین بلو نے کہا کہ اس کانفرنس سے مختلف علاقائی
زبانوں کی انحطاط پذیری، وجوہات جاننے اور انہیں دور کرنے میں
مدد ملے گی۔ کانفرنس کی اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے
امریکی سفارت خانے کے کلچرل اتاشی برائن گیبل نے کہا کہ امریکہ کا
سفارت خانہ کانفرنس منعقد کرانے کے اقدام کو سراہتا ہے۔ لسانیات کو
درپیش مسائل کے حل کے لیے ہم جامعہ کشمیر کے ساتھ حصہ داری
کریں گے اور ہمارا تعاون جاری رہے گا۔ نے کہا کہ زبان صرف
رابطے کا باعث نہیں بلکہ دوسری ثقافت اور قدروں کو سیکھنے کا موقع بھی
دیتی ہے لہٰذا دوسری زبان کا سیکھنا بہت مفید ہوتا ہے۔ کانفرنس کے
اختتام پر پاکستان و آزاد جموں و کشمیر کے ماہرین لسانیات نے متفقہ
رائے سے پاکستان ایسوسی ایشن برائے لسانیات کے قیام کا اعلان
کیا۔ (PALs) پالز (ایسوسی ایشن) لسانیات کے بارے میں
پاکستان میں زبانوں کے تحفظ کے لیے بنائی جانے والی پہلی تنظیم ہے
جس میں پہلے ہی دن ۱۰۰ سے زائد ماہرین لسانیات نے باقاعدہ ممبر
شپ حاصل کی اور ممبران کی اکثریت نے پالز کے تنظیمی انتخابات کا
مطالبہ بھی کیا۔ باقاعدہ انتخابات کے بعد ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف
لینگویجز جامعہ کشمیر ڈاکٹر عائشہ سہیل کو صدر اور مہران یونیورسٹی کے
ڈاکٹر حبیب اللہ پٹھان کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ پالز کے قیام کا
بنیادی مقصد لسانیات کے بارے میں تحقیقی کام کو فروغ دینا ہے
اور ماہرین لسانیات کے آپس میں رابطے میں اضافہ کرتا ہے۔

لاہور ہائی کورٹ میں اردو زبان کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کی درخواست سماعت کے لیے منظور

لاہور ہائی کورٹ کے جناب جسٹس مظاہر علی اکبر نقوی نے ملک میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کے لیے دائر رٹ درخواست کو سماعت کے لیے منظور کرتے ہوئے دفاقی وصوبائی حکومت اور سیکرٹری تعلیم کو نوٹس جاری کرتے ہوئے جواب طلب کر لیا۔ ڈاکٹر محمد شریف نظامی کی طرف سے آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ (الف) اور ۲۵۱ (الف) کے تحت دائر رٹ درخواست میں ان کے وکیل اے کے ڈوگر نے دلائل میں م قف اختیار کیا کہ دستور پاکستان کے تحت پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ دستور کے مطابق آئین کے نفاذ سے پندرہ برس کے اندر اردو کو بطور سرکاری زبان و دیگر مقاصد کے لیے رائج کیا جانا تھا۔ آرٹیکل ۲۵۱ کی ذیلی شق ۳ قرار دیتی ہے کہ قومی زبان کی حیثیت کو متاثر کیے بغیر صوبائی اسمبلیاں قومی زبان اردو کے علاوہ کسی صوبائی زبان کی ترقی کے اقدامات تجویز کر سکیں گی۔ مذکورہ آرٹیکل کے مندرجات تاکیدی ہیں جن پر عملدرآمد کروانا حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے۔ درخواست میں مزید کہا گیا ہے کہ ماضی میں انگریزی کبھی بھی سائنسی زبان نہیں رہی۔ وہی قومیں کامیاب ہیں جنہوں نے اپنی قومی زبان کا سہارا لیا۔ درخواست میں استدعا کی گئی کہ آئین کی دفعہ ۲۵۱ (الف) کو فوری نافذ کرنے اور حکومت پنجاب کی طرف سے ۱۴ ستمبر ۲۰۰۹ء کو تعلیمی نصاب کو انگریزی میڈیم میں تبدیل کرنے کا حکم نامہ کالعدم قرار دیا جائے۔

مشہود مرزا کی اضافی ذمہ داریاں



وزارت اطلاعات ونشریات وقومی ورثہ کے جائنٹ سیکرٹری ایڈمن مشہود مرزا نے ادارہ فروغ قومی زبان کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کی حیثیت سے اضافی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ اس سے قبل یہ اضافی ذمہ داریاں مذکورہ وزارت کے جائنٹ سیکرٹری محمد بلال کے پاس تھیں۔

اردو ادب کے سب سے زیادہ تراجم جاپان میں ہو رہے ہیں

پاکستان اور جاپان کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان حکومتی بلکہ عوامی سطح پر بھی محبت کا ایک رشتہ قائم ہے اور جاپان کی اہم جامعات میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور جاپان اردو زبان کی تدریس اور اردو ادب کے تراجم کی اشاعت کا اہم مرکز بھی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اردو ادب کے سب سے زیادہ تراجم جاپان میں ہو رہے ہیں۔ ان تراجم کی اشاعت کے لیے ایک کتابی سلسلہ اردو ادب کے نام سے جاری ہے اور ہر سال اس سلسلہ کا ایک شمارہ ضرور شائع ہوتا ہے۔



انتظار حسین عالمی بکرز ایوارڈ ۲۰۱۳ء کے مصنفین کے ہمراہ جبکہ انعام حاصل کرنے والی مصنفہ بھی موجود ہیں

اکادمی ادبیات کے زیر اہتمام اسلام آباد میں اہل قلم کے لیے کافی ہاؤس کا قیام

''رائٹرز کافی ہاؤس'' ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور فنون لطیفہ کے لوگوں کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کرے گا۔ ان خیالات کا اظہار عبدالحمید، چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان نے اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد میں اہل قلم کے لیے ''رائٹرز کافی ہاؤس'' قائم کرنے کے حوالے سے اسلام آباد/راولپنڈی کے ادیبوں، ادبی تنظیموں کے عہدیداروں اور صحافیوں کو ایک ملاقات میں ''رائٹرز کافی ہاؤس'' کے حوالے سے بریفنگ دیتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی ادبیات پاکستان ادیبوں کی فلاح و بہبود اور ادب کے فروغ کے لیے مسلسل کوشاں ہے اس سلسلے میں ادیبوں کے لیے ایک ایسی جگہ کی فراہمی ہے جہاں ادیب، دانشور، صحافی، مصور اور زندگی کے مختلف شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے احباب بیٹھ سکیں۔ راولپنڈی اور اسلام آباد میں اہل قلم مختلف جگہوں پر بیٹھتے ہیں اس لیے اکادمی نے یہ محسوس کیا کہ پاک ٹی ہاؤس لاہور کی طرز پر اسلام آباد میں ''رائٹرز کافی ہاؤس'' کے نام سے معیاری جگہ بنائی جائے جہاں چائے، کھانا وغیرہ ارزاں نرخوں پر دستیاب ہو اور لکھنے والوں کو کوئی ایک جگہ مل سکے۔ یہ روایت رہی ہے کہ اہل قلم اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے بیٹھنے کے لیے مختلف شہروں میں جگہ موجود ہے جیسے لاہور میں پاک ٹی ہاؤس، کراچی میں آرٹ کونسل اور پشاور میں قہوہ خانہ مشہور جگہیں ہیں، اسلام آباد ایک ادبی مرکز بن چکا ہے لیکن ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ادیب دانشور جمع ہوسکیں۔ رائٹرز کافی ہاؤس کے قیام کا مقصد یہی ہے کہ ادیب ایک جگہ بیٹھ سکیں اور دیگر شہروں سے آنے والے ادیب بھی مقامی اہل قلم سے ملاقات کرسکیں۔

عبداللہ حسین کے ساتھ شام ملاقات

عبداللہ حسین نے کہا کہ ناول لکھنا ایک انتہائی کٹھن اور دشوار گذار سفر ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ادیب سہل پسند ہوگئے ہیں۔ اسی طرح ناول پڑھنے والوں میں بھی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ طویل ناول کا مطالعہ کرسکیں، یہ ایک المیہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار ملک کے نامور ناول نگار، ادیب اور دانشور عبداللہ حسین نے اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام منعقدہ شام ملاقات میں اپنے تخلیقی سفر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔ عبداللہ حسین نے کہا کہ ناول ایک عالی شان مکان کی طرح ہوتا ہے جس کی ایک ایک اینٹ احتیاط سے رکھنا پڑتی ہے اور چھت تک کے مراحل طے کرنا ہوتے ہیں۔ ناول نگار ایک مستند آرکیٹیکچر کی طرح ہوتا ہے، جو جتنا ذہین ہوتا ہے اسی قدر اس کے کام میں نفاست ہوتی ہے، انھوں نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں ادب میں سیاست لے آتا ہوں۔ یہ درست ہے کیونکہ ادب سے سیاست کو کسی بھی طور الگ نہیں دیکھ سکتا جہاں کہیں بھی ادیب ظلم اور استحصال دیکھتا ہے چاہے اس میں سیاست دان ہوں یا عام آدمی اسے ضرور سچ لکھنا چاہیے۔ ادیب حالات سے تنگ ہوکر لکھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مظفر علی سید نے پہلے مجھے زبان میں گھپلا کرنے کا الزام دیا تھا بعد میں انھوں کہا کہ آپ کی زبان کا وقت متقاضی ہے۔ میرے ناولوں کو بھارت میں شمس الرحمان فاروقی نے اور شمیم حنفی نے بھی سراہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''اداس نسلیں'' کا کسی نے انگریزی میں ترجمہ نہیں کیا۔ یونیسکو کے کہنے پر میں نے از خود اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان عبدالحمید نے کہا کہ عبداللہ حسین کے ناولوں میں سیاسی شعور نمایاں اور بھر پور حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عبداللہ حسین اردو ادب کے سیاسی شعور کے حامل ناول نگار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عبداللہ حسین کے ناول عالمی ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، ہمارے ہاں ناول نگاری کی طرف کم توجہ دی گئی ہے لیکن اس کے باوجود عبداللہ حسین نے محنت اور مطالعے کے زور سے ناول نگاروں میں اہم حیثیت حاصل کرلی ہے۔ یوں ان کے ناول اردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا ''اداس نسلیں'' میں قیام پاکستان اور اس کے بعد کے واقعات کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے جب کہ دوسرے ناول ''نادار لوگ'' میں سماجی ناانصافی، استحصال اور معاشرے کی بے سمتی کا نوحہ بیان ہوا ہے۔ انھوں اکادمی کی طرف سے عبداللہ حسین اور شرکاء محفل کا شکریہ ادا کیا۔ عائشہ صدیقہ نے کہا کہ عبداللہ حسین کے ناولوں میں عام آدمی کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ پنجاب کے ثقافت کی بھی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے جب کہ زبان و بیان کے حوالے سے بہت خوبصورت تجربات کیے گئے ہیں۔ امجد طفیل نے کہا کہ عبداللہ حسین ان خوش قسمت لکھنے والوں میں سے ہیں جن کو قارئین کا ایک وسیع حلقہ گزشتہ پچاس سال سے میسر ہے اور وہ ناقدین کی توجہ کا بھی مرکز رہے ہیں۔ نجیب جمال، شبیہہ الحسن رضوی، الطاف قریشی، کامران کاظمی، عزیز احمد خان نے عبداللہ حسین سے سوالات کیے۔ اس تقریب کی نظامت محمد عاصم بٹ نے کی۔



عبداللہ حسین کے ساتھ ایک شام ملاقات

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

اردو کی اولین قواعد

اس قواعد کو جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک جرمن ملازم نے ۱۶۹۸ء میں ولندیزی زبان میں لکھنؤ میں تحریر کیا اور یہ اب پہلی بار بڑے اہتمام سے تین جلدوں میں جاپان سے شائع ہوئی ہے۔

دستیاب شواہد کی روشنی میں اس بات پر اب قریب قریب اتفاق ہے کہ اردو کی اولین قواعد مقامی علماء میں سے میرزا فخر الدین محمد (میرزا جان ابن فخر الدین محمد خان) نے اپنی ہمہ موضوع فارسی تصنیف ''تحفۃ الہند'' میں تحریر کی تھی جو اگر چہ ۱۶۷۶ء سے قبل کی تصنیف ہے لیکن مصنف نے اس میں اپنے مربی اعظم شاہ (۱۷۰۷ء)، فرزندِ اورنگ زیب عالم گیر (۱۶۵۸ء۔۱۷۰۷ء) کی خوشنودی یا ایماپر، جو برج بھاشا کا سر پرست بتایا جاتا ہے، ۱۷۱۱ء میں اضافہ کر کے لغت اور یہ قواعد شامل کی تھی[1]۔ قواعد کے ضمن میں مقامی علماً کی جانب سے یہ دستیاب اولین کاوش تھی لیکن یورپی افراد کی جانب سے یورپی زبانوں میں اردو اور مقامی زبانوں کی قواعد لکھنے کا سلسلہ بھی آس پاس کے عرصے میں جاری تھا[2] بلکہ اگر ''تحفۃ الہند'' کے حصہ قواعد کی تصنیف کا سال ۱۷۱۱ء کو مان لیا جائے تو اردو کی اولین قواعد ایک یورپی باشندے جون جوسوا کیٹیلار (Joan Josua Ketelaar) نے ۱۶۹۸ء میں لکھی تھی۔ یہ کیٹیلار ہی تھا جس نے بعد کے عرصے میں دیگر مستشرقین کو اس راہ پر گامزن ہونے کی تحریک دی۔

کیٹیلار (خاندانی نام: کیٹلر) ایک معرکہ آراء شخص تھا جس نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ ۲۵ دسمبر ۱۶۵۹ء کو جرمنی کے ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے ایلبنگ (Elbing) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کیٹلر ایک جلد ساز تھا جس کی وجہ سے خود اس نے جلد سازی شروع کی لیکن فطرت میں نچلا بیٹھنا پسند نہ تھا، چنانچہ چوری بھی کی اور اپنے مالک کو زہر بھی دینے کی کوشش کی، لہٰذا نوکری سے نکال دیا گیا۔ یہاں سے نکل کر وہ دانزنگ یا دانسک (Danzig or Gdansk) چلا گیا، جہاں وہ پھر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس طرح وہ وہاں سے بھی نکل کر ۱۶۸۰ء میں اسٹاک ہوم چلا گیا۔ وہاں وہ دو سال رہا اور پھر اپنے خاندانی نام کیٹلر کو تبدیل کر کے کیٹیلار رکھ لیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک معمولی سی ملازمت اختیار کر کے ۱۶۸۳ء میں ہندوستان آ گیا۔ یہاں اس نے بہت جلد ترقی کی اور تجارتی امور اس خوبی سے انجام دیے کہ اہم ذمے داریاں اس کے سپرد کی جانے لگیں۔ ۱۷۰۸ء میں اسے اس بنیاد پر کہ اس نے ''مورش'' (Moorish، مسلمانوں کی) زبان اور ثقافت میں مہارت پیدا کر لی تھی، ''سینئر مرچنٹ'' کا عہدہ دے دیا گیا اور ۱۷۱۱ء میں کمپنی کا ''ناظم تجارت'' مقرر کر دیا گیا۔ اس عرصے میں اس نے مغل حکمرانوں بہادر شاہ اول (۱۷۰۸۔۱۷۱۱ء) اور جہان دار شاہ (۱۷۱۲ء) کے درباروں میں رسائی حاصل کر لی تھی۔ ۱۷۱۲ء میں اس نے ولندیزی سفارت خانے کے سفیر کی حیثیت میں جہان دار شاہ سے شاہی فرامین کے تعلق سے سفارتی اور تجارتی نوعیت کے مذاکرات کیے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے مستقر سورت سے دہلی تک آمد و رفت کے جو سفر کیے، ان میں اس نے راستوں کے علاقائی تمدن اور زبانوں کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ ۱۷۱۵ء میں اس نے ایلچی ولندیز کی حیثیت میں تقرر پا کر ایران کا سفر بھی کیا اور مزید تجربات حاصل کیے۔ واپسی کے سفر میں بندر عباس کے قریب اس نے عرب مداخلت کاروں سے مقابلے کے لیے وہاں کے صوبے دار کا حکم ماننے سے انکار کر دیا جس پر اسے قید میں ڈال دیا گیا۔ قید کی حالت میں وہ بیمار پڑ گیا اور ۱۲ مئی ۱۷۱۸ء کو انتقال کر گیا[3]۔

الفاظ کی فہرست کے اعتبار سے یہ قواعد ایک لغت بھی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ چاہے ایک لغت کہی جائے یا ایک قواعد، اس نے بہر حال مقامی زبانوں کی قواعد نویسی کی ایک روایت کا آغاز ضرور کیا۔ اس نے مقامی زبانوں کی قواعد نویسی کی ایک عام اور مروج صورت کو پیش کیا

کیٹیلار نے جو ایک بھرپور اور متحرک زندگی گزاری اور جو تجربات خاص طور پر ہندوستان کی مقامی معاشرت اور تمدن کے حاصل کیے، انھوں نے اس کی زبان دانی کی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ زبانوں سے اس کو خاصی دلچسپی رہی کہ اس نے یہاں ہندوستانی یا اردو سیکھی اور ساتھ ہی فارسی اور عربی میں بھی وہ آسانی سے معاملات کو لیتا تھا اور اپنے اسی وصف کی بدولت اس نے کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ اس نے گجرات کے اپنے قیام کے علاوہ راجستھان، آگرہ، دہلی اور لکھنؤ میں بھی زندگی گزاری جس کے باعث وہ متعدد زبانوں میں اپنے منصبی فرائض کامیابی سے ادا کرتا رہا۔ اس کی زندگی کے اس رخ نے اسے اردو قواعد لکھنے کی طرف مائل کیا جو اس امر کا مظہر بھی ہے کہ اس نے دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو یا ہندوستانی ہی کو اس وقت کی سب سے اہم اور شاید مستقبل کی زبان سمجھ کر اس کی طرف بطور خاص توجہ کی اور ''اولین اردو قواعد'' لکھ ڈالی۔ اس کے جواز میں سنیتی کمار چٹرجی نے بھی اس قواعد کا تعارف کرواتے ہوئے یہی تسلیم کیا کہ اس وقت اردو یا ہندوستانی ہی لاہور، دہلی، آگرہ سے سورت تک ''لنگوا فرینکا'' تھی[4]۔

کیٹیلار کا رجحان مذہب سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ باقاعدگی سے اپنے پیدائشی علاقے ایلبنگ کے ''پروٹسٹنٹ'' گرجا گھروں کو بھیجا کرتا تھا۔ قواعد میں بطور مثال ایسے الفاظ اور جملے بھی بکثرت ہیں جو عبادات اور ان کے ادا کرنے سے متعلق ہیں یا پھر آقا اور محکوم یا نوکر اور مالک کے درمیان بات چیت کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس قواعد کے متن اور الفاظ اور جملوں سے اس کے لکھنے کا مقصد اس طور پر نمایاں ہوتا ہے کہ جیسے کیٹیلار نے اسے تجارتی، استعماری اور تبلیغی و ثقافتی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔ اس کی نوعیت اور اس کا مقصد کسی کو ایک زبان کے طور پر سکھانا یا تعلیم دینا نہیں تھا، چنانچہ اس کے منتخب کردہ الفاظ اور جملے تنوع کے لحاظ سے محدود ہیں اور زیادہ تر مذکورہ ضرورتوں ہی کا احاطہ کرتے ہیں۔ چونکہ کیٹیلار نے ہندوستانی معاشرت اور زندگی کی تمام سطحوں کا تجربہ حاصل کیا تھا اور متعدد مقامی زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی اس لیے اس کی قواعد اور اس میں شامل الفاظ کی فہرست میں ''لنگوا فرینکا'' ہندستانی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی، پنجابی، گجراتی اور الفاظ بھی ملتے ہیں اور یہ اپنی سطح کے مطابق نچلی ''بازاری'' زبان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں اور فصیح و بلیغ معرّب و مفرّس ''ہندوستانی'' کا آمیزہ بھی ہیں[5]۔ جو جملے یا زبان کیٹیلار نے استعمال کی ہے، وہ ''کھڑی بولی'' ہے۔

اپنی نوعیت اور اس میں شامل الفاظ کی فہرست کے

۱۶۹۸ء میں یہ قواعد لکھی گئی لیکن ایک عرصے تک کسی صورت میں بھی شائع نہ ہوئی اور اس کا واحد قلمی نسخہ نیدر لینڈ کے ایک چھوٹے سے شہر دی ہیگ کے مخطوطات کے کتب خانے میں محفوظ رہا۔ پہلے پہل اسے علمی دنیا سے ایک جرمن مستشرق بینجمن شلزے نے متعارف کرایا

اعتبار سے یہ قواعد ایک لغت بھی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ چاہے ایک لغت کہی جائے یا ایک قواعد، اس نے بہر حال مقامی زبانوں کی قواعد نویسی کی ایک روایت کا آغاز ضرور کیا جو اگر چہ کسی درسی مقصد سے وجود میں نہیں آئی لیکن اس نے مقامی زبانوں کی قواعد نویسی کی ایک عام اور مروج صورت کو پیش کیا۔ اس میں کیٹیلار نے نہ زبان کے ضوابط اور اصولوں سے بحث کی نہ معیار پر اصرار کیا۔ ان سے قطع نظر اس نے ہندوستانی قواعد نویسی کے مؤرخین کے لیے ایک ابتدائی نمونہ ضرور فراہم کر دیا جسے تاریخ میں ایک اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک واقعتاً بڑا کام تھا جس نے اردو کے ابتدائی ذخیرۂ الفاظ کو مرتب شکل میں یکجا بھی کر دیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اور متعدد زبانوں کے الفاظ کا آمیزہ ہونے کی وجہ سے اور جملوں کی ساخت اور عام بول چال کے اسالیب کے باعث لسانی نقطۂ نظر سے بے حد مفید و کار آمد بھی ہے۔ یہ ذخیرہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں سماجی لسانیات کے مطالعے کے لیے بھی ایسا مواد موجود ہے کہ جس کے ذریعے گزشتہ تین سو سالوں کے لسانی تغیرات کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ کچھ یہی صورت ''تحفۃ الہند'' میں شامل ذخیرۂ الفاظ کو دیکھ کر بھی کہی جا سکتی ہے۔

۱۶۹۸ء میں یہ قواعد لکھی گئی لیکن ایک عرصے تک کسی صورت میں بھی شائع نہ ہوئی اور اس کا واحد قلمی نسخہ نیدر لینڈ کے ایک چھوٹے سے شہر دی ہیگ (The Hague) کے مخطوطات کے کتب خانے میں محفوظ رہا۔ پہلے پہل اسے علمی دنیا سے ایک جرمن مستشرق بینجمن شلزے نے متعارف کرایا اور اپنی تصنیف "A Grammar of Hindustani Language" کے مقدمے میں جو ۱۷۴۴ء میں اس نے تحریر کیا تھا، اس کا ذکر کیا[۶]۔ ویسے شلزے نے اعتراف کیا کہ یہ قواعد اس کی نظر سے نہیں گزری لیکن اسی سال ایک اسکالر ڈیوڈ ملز (David Mills) نے اس قواعد کو کسی طرح حاصل کر کے اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کر کے شائع کر دیا[۷]۔

ایک اسی طرح کا مختصر ذکر جارج اے گریرسن (George A. Grierson) نے اپنے معروف لسانی جائزے "A Linguistic Survey of India" میں کیا لیکن تفصیلات نہ بتائیں[۸]۔ ان سب سے قطع نظر اس قواعد کا سب سے مفصل تعارف اور تجزیہ سنیتی کمار چٹرجی نے ۱۹۳۱ء میں تحریر کیا جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا[۹]۔ اس وقت تک یہ گمان کیا جا رہا تھا کہ اب اس قواعد کا وجود نہیں رہا اور یہ ضائع ہو چکی ہے لیکن فوگل نے سنیتی کمار کے مقالے کو پڑھ کر یہ اطلاع دی کہ قواعد کا مخطوطہ نیدر لینڈ کے شاہی مخطوطات (دی ہیگ) میں موجود ہے[۱۰]۔ اس کی موجودگی کا علم ہو جانے کے باوجود، اصل مخطوطے سے استفادہ کرنے کی بجائے، لاطینی سے اس کا ایک ہندی ترجمہ میتھیو ویچور (Methew Veechoor) نے شائع کیا[۱۱]۔

ان متعدد کاوشوں اور حوالوں کے بعد اس قواعد کے مذکورہ مخطوطے تک بالآخر تیج کمار بھاٹیا، پروفیسر ہندی، سیرا

اس قواعد میں کیٹیلار نے نہ زبان کے ضوابط اور اصولوں سے بحث کی نہ معیار پر اصرار کیا۔ ان سے قطع نظر اس نے ہندوستانی قواعد نویسی کے مؤرخین کے لیے ایک ابتدائی نمونہ ضرور فراہم کر دیا جسے تاریخ میں ایک اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک واقعتاً بڑا کام تھا جس نے اردو کے ابتدائی ذخیرۂ الفاظ کو مرتب شکل میں یکجا بھی کر دیا ہے

کوسے (Syracuse) یونیورسٹی نے کامیابی حاصل کی اور اس کے عکس کا غائر نظر سے جائزہ لے کر اور اس کا تقابل اس کے لاطینی ترجمے سے کر کے یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ اس قواعد کا کم از کم ایک اور نسخہ کہیں موجود رہا ہے جس سے لاطینی ترجمہ کیا گیا، کیونکہ اس لاطینی ترجمے اور اصل مخطوطے کے متن میں فرق پایا جاتا ہے[۱۲]۔ بھاٹیا نے اس مخطوطے کا عکس حاصل کر کے اس کے تعارف پر مشتمل اولاً ایک مقالہ تحریر کیا[۱۳]۔ اور پھر تقریباً دو دہائیوں کی محنت سے اسے بڑے اہتمام اور سلیقے سے بعنوان: The Oldest Grammar of Hindustani: Contact, Communication and Colonial Legacy مرتب کیا، جسے جاپان میں ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار لینگویجز اینڈ کلچرز آف ایشیا اینڈ افریقہ نے ۲۰۰۸ء میں تین جلدوں میں شائع کیا۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں ہندی کے پروفیسر کازوہیکو ماچیدا، جنھوں نے ہندی زبان اور لسانیات پر کئی قابل قدر اور مفید کام کیے ہیں، اس قواعد کی ترتیب و تدوین اور مطالعے و تجزیے میں ان کے شریک رہے ہیں۔ اس اشاعت کے علاوہ ایک کوشش ممتاز اسکالر محمد اکرام چغتائی کے پیش نظر بھی ہے، جس کا ایک عکس انھوں نے بھی بہت پہلے دی ہیگ کے مخطوطات سے حاصل کیا تھا اور اب وہ اسے مرتب کر رہے ہیں[۱۴]۔

زیرِ نظر اشاعت کی جلد اول، دو ذیلی حصص پر مشتمل ہے، جس میں سے حصہ اول ''تاریخی اور باہمی ثقافتی سیاق'' کا احاطہ کرتا ہے جسے تیج کمار بھاٹیا نے لکھا ہے۔ دراصل یہ مقدمہ ہے جس میں اس قواعد اور اس کے مصنف کا مکمل تعارف اور اس قواعد و لغت کی خصوصیات اور موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں ''قواعد کا ذخیرۂ الفاظ اور ان کا تجزیہ'' کیا گیا ہے جو دونوں مرتبین کی مشترکہ کاوش ہے۔ دوسری جلد میں ''لغت کے ذخیرۂ الفاظ کا تجزیہ'' کیا گیا ہے اور یہ بھی دونوں کی مشترکہ کوشش ہے۔ اصلاً یہ ساری قواعد اور لغت کا مکمل متن ہے جسے تجزیے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تیسری جلد تمام تر کیٹیلار کی قواعد کا متن یا اس کے ہاتھ سے لکھا ہوا مسودہ ہے جس کا اس جلد میں مکمل عکس دے دیا گیا ہے۔

اس قواعد کے فاضل مرتبین نے اس کے مخطوطے کی دریافت اور اشاعت کو ''ہندی'' قواعد نویسی کی تاریخ کا گزشتہ تین سو سالوں کا ایک اہم واقعہ قرار دیا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ''ہندی زبان'' کی قواعد کی روایت اور تاریخ کا کھوج لگانے کی متعدد کوششیں مختلف سمتوں میں کی جا رہی ہیں، اس کی اشاعت کو اس ضمن میں ایک سنگِ میل سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ایک واقعہ بھی ہے لیکن یہ انصاف اور دیانت کے اصولوں کے خلاف ہے کہ ''ہندوستانی'' کی اس قواعد کو جس کے ذخیرۂ الفاظ اور جملوں میں استعمال ہونے والے الفاظ میں عربی و فارسی کے الفاظ کی بہتات ہونے اور خود اس کے مرتب کی جانب سے اس کے ''ہندوستانی'' کی قواعد قرار دیے جانے کے باوجود ان مرتبین نے اسے ''ہندی قواعد'' قرار دینے میں کسی قسم کا تامل نہیں کیا ہے، جو افسوس ناک ہے۔ متعدد مقامات پر نسخ و نستعلیق میں مثالوں کے باوجود کہ ہندی الفاظ کے لیے بھی دیوناگری یا سنسکرت رسم الخط کیٹیلار نے استعمال نہیں کیے، مرتبین کا اسے ہندی کی قواعد قرار دینا لسانی عصبیت ہی کہی جا سکے گی۔ عربی فارسی الفاظ کی کثرت اور اس وقت کے لسانی مناظر و شواہد کو نظر انداز کرتے ہوئے ''ہندوستانی'' (یا اردو) کو ''ہندی'' قرار دینے کے عمل کے پس پشت جو مذہبی، قومی اور ثقافتی عصبیت کارفرما ہے اس میں کوئی کلام نہیں۔ جس زبان کو فورٹ ولیم کالج میں ۱۸۰۲ء کے بعد شناخت اور رسم الخط نصیب ہوا ہو، وہ تو اس عصبیت کے نتیجے میں ہمیشہ سے

> اس قواعد کے فاضل مرتبین نے اس کے مخطوطے کی دریافت اور اشاعت کو''ہندی'' قواعد نویسی کی تاریخ کا گزشتہ تین سو سالوں کا ایک اہم واقعہ قرار دیا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ''ہندی زبان'' کی قواعد کی روایت اور تاریخ کا کھوج لگانے کی متعدد کوششیں مختلف سمتوں میں کی جا رہی ہیں

''ہندی'' رہی اور اردو اس کے مطابق ۱۷۸۰ء سے اردو کہلانے کی وجہ سے ہندی کے مقابلے میں ہندوستان کی سب سے کم عمر زبان ہے[۱۵]۔ جبکہ ۱۷۸۰ء سے بھی پہلے اس زبان کے لیے ''اردو'' کا نام استعمال میں آتا رہا ہے۔ اس طرح افسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ فاضل مقدمہ نگاروں نے قواعد کے اصل عنوان میں شامل قواعد کی زبان کے نام ''ہندوستانی'' کو اپنے مقدمے میں بارہا ''ہندی'' تحریر کیا اور ''ہندی'' ہی قرار دیا، جس کی اخلاقی اصولوں اور علمی دیانت کے لحاظ سے گنجائش نہ تھی۔

اس ایک محلِ نظر امر سے قطع نظر تیج کمار بھاٹیا اور کازوہیکو ماچیدا کی یہ کوشش بلاشبہ لائقِ تحسین ہے اور ایک ایسی عمدہ مثال ہے کہ کسی ایسی تصنیف اور اس کتاب کے متن کو کس طرح ایک بے حد فاضلانہ و معلوماتی مقدمے کے ساتھ ضروری تجزیے و مطالعے اور گوشواروں کی مدد سے مرتب اور پیش کرنا چاہیے۔

حواشی

۱۔ اس تصنیف A Grammar of the Braj Bhasha by Mirza Khan (1676) کے متعدد قلمی نسخے ہندوستان اور برطانیہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں لیکن اس کا ایک نسخہ ایم۔ ضیاء الدین نے مرتب کیا تھا۔ مطبوعہ، کلکتہ: وشوا بھارتی بک شاپ، ۱۹۳۵ء۔

۲۔ ان کاوشوں کا ایک معلوماتی جائزہ، متعدد تصانیف، مآخذ کے علاوہ، مولوی عبدالحق، مقدمہ ''قواعد اردو''، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۶ء ص ۲۰-۱۱۸، اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مقدمہ ''ہندوستانی گرائمر''، مصنفہ بنجمن شلزے، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص: ۲-۳۷ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ کیٹیلار کے حالات اس کی زیر نظر تصنیف کے فاضل مرتب تیج کمار بھاٹیا اور کازوہیکو ماچیدا نے اپنے معلوماتی مقدمے میں تحریر کیے ہیں: The Oldest Grammar of Hindustani: Contact, Communication and Colonical Legacy، تین جلدیں، مطبوعہ: ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار لینگویجز اینڈ کلچرس آف ایشیا اینڈ افریقہ، ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز، ٹوکیو، ۲۰۰۸ء جلد اول، صفحہ ۲۶؛ یہ مقدمہ اس زیر نظر تحریر کا بنیادی ماخذ بھی ہے۔ ونیز وفوگل، جے Joan Josua Ketelaar of (Vogel.J.)Elbing, Author of the First Hindustani Grammar، مشمولہ: Bulletin of the School of African and Oriental Studies، ص ۸۱۷-۸۲۲، جلد ۸ جو خود فاضل مقدمہ نگار کا بھی بنیادی ماخذ ہے۔ افسوس کہ فاضل مقدمہ نگاروں نے قواعد کے اصل عنوان میں شامل نام ''ہندوستانی'' کو اپنے مقدمے میں بارہا ''ہندی'' تحریر کیا جس کی اصول اور دیانت کے لحاظ سے گنجائش نہ تھی۔

۴۔ "The Oldest Grammar of Hindustani"، چٹرجی نے اپنا یہ مقالہ ۱۹۳۱ء میں لکھ کر اولاً ۱۹۳۳ء میں شائع کیا تھا۔ مشمولہ: "Indian Linguistics"، جلد ۲، ۱۹۶۵ء، ص ۸۳-۶۸۔

۵۔ چٹرجی نے اسی بنیاد پر اس قواعد میں شامل الفاظ کو دو سطحوں کا مجموعہ بتایا ہے۔ ایک ادنیٰ اور ایک اعلیٰ، جو معاشرے کے ان ہی طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تصنیف مذکور، ص ۷۸۔

۶۔ مقدمہ (انگریزی)، ص ۳، مشمولہ ''ہندوستانی گرائمر''، ترتیب و ترجمہ و تعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مطبوعہ: مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۷۔ "De Lingua Hindustani ca"، مشمولہ: "Dissertationes Selectae"، لائیڈن، ۱۷۴۳ء، مرتبہ ڈیوڈ ملس، سی وشوف، جی۔ جے وشوف پبلشرز۔ ص ۴۸۸-۴۵۵۔

۸۔ "A Linguistic Survey of India"، جلد ۹، حصہ ۱، دہلی، ۱۹۱۶ء، ص ۸-۶۔

۹۔ "The Oldest Grammar of Hindustani"۔ محولہ بالا:[۴]

۱۰۔ تصنیف مذکور، ص: ۸۲۱۔

۱۱۔ مطبوعہ: الہ آباد، ۱۹۷۶ء۔

۱۲۔ تصنیفِ مذکور، جلد اول، ص ۱۹۔

۱۳۔ "The Oldest Grammar of Hindustani"، مشمولہ: Syracuse Scholar، ۴(۳)، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۰۱-۸۱۔

۱۴۔ مکتوب بنام راقم، مؤرخہ ۷ ستمبر ۲۰۱۱ء

۱۵۔ بھاٹیا اور ماچیدا، ص ۷۔

ادبیات

سید نجم سبطین حسنی (آسٹریلیا)

اردو شاعری اور کربلا

(خصوصی حوالہ میر ببر علی انیس)

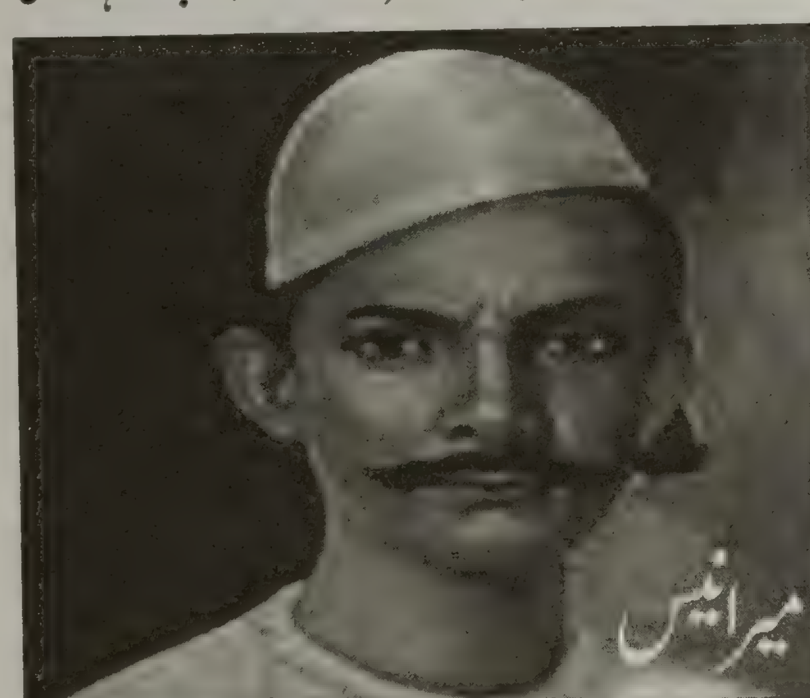
کربلائی حوالہ کی شاعری کا موضوع سامنے آئے تو میر ببر علی انیس کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ اردو اکادمی آف آسٹریلیا کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے مطالعاتی سطح پر زبان، شخصیات اور تہذیب کی علمی و تحقیقی خدمت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ایک مکمل شام مرثیہ اور خدائے سخن حضرت میر انیس جیسی شخصیت کے نام کرتے ہوئے ان جیسے محسنِ فکر و ادب کے تذکرہ کی ترویج کو اہلِ ادب کی ذمہ داریوں میں شمار کر کے ایک صحتمند رویہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔

شاعری اور کربلا

ہر زبان کے ادب نے کربلا کے موضوع سے فکری روشنی حاصل کی ہے۔ کربلا محض ایک حدیثِ غم ہی نہیں بلکہ اسرارِ حیات و کائنات کی معرفت سے بھرپور ایک بے مثال اخلاقی و تربیتی مخزن بھی ہے۔ یوں تو اردو ادب کی تمام تخلیقی اصناف کربلا کے ادراک سے لبریز نظر آتی ہیں لیکن اردو شاعری کی تاریخ اس موضوع کے بغیر اپنی شناخت ہی مکمل نہیں کر پاتی۔ اردو شعر و ادب کربلا سے صرف متاثر ہی نہیں ہوئے بلکہ مضمونِ کربلا نے اردو شاعری کو کئی گرانقدر اصناف سے آراستہ بھی کیا ہے۔ تاریخِ ادب کے جائزہ سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ سلام، مرثیہ، نوحہ اور منقبت جیسی اصناف کی تجسیم و تخلیق کربلا کے بغیر ناممکن تھی۔

تاریخی پس منظر

اردو کئی زبانوں کے اختلاط سے وجود میں آنے والی ایک لشکری زبان ہے لیکن اس کے علمی ماخذات پر نگاہ کی جائے تو عربی اور فارسی ادب کے رجحانات اس کی پرورش میں زیادہ غالب اور فعّال نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو ادب میں بھی مضامینِ کربلا کی فکری میراث فارس و عرب ہی کے واسطوں سے داخل ہوئی۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ اردو شاعری نے اس موضوع کو اپنے رگ و پے میں کچھ اس نفاست اور انفرادیت سے جگہ دی کہ بسا اوقات کربلا کا عنوان اردو شاعری کا بالکل ذاتی اور فطری موضوع محسوس ہونے لگتا ہے۔ کم از کم ۱۵۰۰عیسوی ہی سے اگر اردو کی تاریخ کا دکن میں قطب شاہی و عادل شاہی ادوارِ سلطنت سے مطالعہ کیا جائے تو اردو کی نثری تالیفات اور شعری تخلیقات کی مقبولیت اور حوصلہ افزائی کا ایک مؤثر ترین افق مجلسِ حسین کو سمجھا جاتا رہا۔ دکن



میں علم اور ادب کے ذخائر نے اردو زبان کو بہت محبت سے گلے لگایا۔ اسی لیے قدیم روز مرّہ میں اردو کو دکنی کے نام سے بھی پہچانا جاتا رہا۔

دکن، لکھنؤ اور دلّی کے دبستان

دکن میں ملک الشعراء نصرتی، کمال خان رستمی، فرمانروائے گولکنڈہ حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ، ملاّ وجہی، غوّاصی اور ولی دکنی سے لے کر دبستانِ دلّی و لکھنؤ میں اردو کی پرورش اور ارتقاء حسینین میرزا رفیع سودا، میر تقی میر، ناسخ، ہمدانی مصحفی، مومن خان مومن، امیر مینائی، خواجہ حیدر علی آتش، میر حسن، میر انیس، میرزا دبیر، جھنو لال دلگیر، اسد اللہ خان غالب، استاد ذوق، بہادر شاہ ظفر، یاس یگانہ چنگیزی اور حسرت موہانی تک اردو شاعری کی تاریخ بنانے والے ان اربابِ ادب کے نام تسبیحِ سخن کے وہ دانے ہیں کہ جن کے بغیر سلکِ اردو کا ورود و وجود ہی مکمل نہیں ہو پاتا۔ اِن میں سے ہر ایک عظیم شاعر کے فکری رجحانات میں کربلا کے رثائی اور معنوی اثرات توانائی کے ساتھ گونجتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اقبال اور عہدِ نو کے شعراء

کلاسیکی عہد کے بعد شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی فکری و شعری دنیا میں بھی کربلا کے شعوری سفر کو جنابِ ابراہیم تا جنابِ حسین جس لامحدود تناظر کے ساتھ سمجھایا گیا اس سے اردو ادب میں کربلا شناسی کا فلسفہ ایک منفرد نظریاتی تحریک کی صورت میں متعارف ہوا۔ اقبال کے بعد آج تک کے شعرائے اردو میں بھی کوئی ایسا نام نہیں جس کا قلم کربلا کے اثرات سے محروم رہا ہو۔ جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، عبدالحمید عدم، احسان دانش، ناصر کاظمی، استاد قمر جلالوی، سرکار علامہ رشید ترابی، عابد علی عابد، سید ضمیر جعفری، جون ایلیا، رئیس امروہوی، شکیب جلالی، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، احمد فراز، منیر نیازی، شیر افضل جعفری، کیفی اعظمی، مصطفیٰ زیدی، کیپٹن جعفر طاہر، مشیر کاظمی، علامہ سید شاد گیلانی، بیدل پانی پتی، علامہ طالب جوہری، سیف زلفی، وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر مسعود رضا خاکی، قیصر بارہوی، افسر عباس افسر، سجاد باقر رضوی، عدیم ہاشمی، مہندر سنگھ بیدی، بیدل حیدری، سید محسن نقوی، محسن احسان، پروین شاکر، فارغ بخاری، ڈاکٹر عاشور کاظمی، مشکور حسین یاد، افتخار عارف، ریحان اعظمی، حسن رضوی، امجد اسلام امجد، عباس تابش، زاہد فخری، سید صفدر ہمدانی، ڈاکٹر خورشید رضوی، سبط جعفر زیدی، شاہد نقوی، ریحان سرور، اختر چنیوٹی، زکی سرور کوٹی، صاحبزادہ رفعت سلطان، پیر نصیر الدین نصیر، ظفر سعید ظفر، سید ندیم عباس شاد، قائم نقوی، سید عقیل محسن نقوی، شوکت رضا شوکت، سید عرفی ہاشمی، ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی، رمیض حیدری اور ان کے علاوہ عہد حاضر کے بہت سے دیگر نامور اور گمنام تخلیق کار ایسے ہیں کہ ان میں سے چند ایک کا قلم تو مرثیہ و سلام نویسی کے لیے ہی مختص رہا جبکہ باقی سخنور غزل و نظم کے ساتھ ساتھ ایک موزوں تناسب کے ساتھ نعت، مرثیہ اور سلام کو بھی لکھتے رہنے کی ادبی روایت کے حامل نظر آتے ہیں۔

بھارت، امریکہ، کینیڈا، انگلینڈ، یورپ اور عرب ریاستوں میں رہنے والے کئی گرانقدر ادبی قامت کے شعرائے اہل البیت کی فہرست اس مضمون میں شامل نہیں ہے لیکن آسٹریلیا میں مقیم کئی شعرائے اردو مثلاً ڈاکٹر سید شبیر حیدر اور صبا صادق بولانی، غزل نوشی گیلانی اور سعید خان کے ساتھ

ساتھ سلام ونعت کہنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

شاعری میں لغاتِ کربلا

عہد قدیم سے لے کراب تک کے شعراء میں اگر مرثیہ کی مخصوص صنف سے ہٹ کرنگاہ کی جائے تو اردو زبان کی غزل کو بھی ہر عہد کے شعراء کربلا کی تشبیہات اور استعارات سے مزیّن کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ اِس میدان میں مسلمان شعراکے علاوہ اردو زبان کے بعض غیر مسلم شعراء کی تخلیقات بھی کربلائی استعارات اور افکار سے لبریز رہی ہیں اور یہ بات کربلا سے اردو کے لازوال رشتے کی گواہی کو اور زیادہ مضبوط کردیتی ہے۔ شاعری میں کربلا کے موضوع کی شعوری ترکیب مرثیہ، سلام، نوحہ اور رباعی میں ظہور کرتی ہے جبکہ اس موضوع کی غیر شعوری ترکیب کا حوالہ اردو غزل ونظم میں موجزن نظر آتا ہے۔ اردو غزل کی لغات میں پیاس، وفا، دشتِ بلا، شام غریباں، مقتل، نوکِ نیزہ، گریہءخون، خیمہ، قفس، درد، خیروشر، تشہیر، کوچہءعشق، فرات، دھوپ، سجدہ، جراحت، ماتم، سفر، یتیمی، تشنہ دہانی، غربتِ جاں، چراغِ خیمہ، آخری وداع، رسن بستگی، صبر، بیکسی، خنجر قاتل، شہیدِ وفا، مسافرت، حُر، گردِ سفر، تیغِ ستم، چہرے پہ خون ملنا، بندشِ آب، سربُریدگی، بازو قلم ہونا، مشکیزہ، دریا، پامالی، بازارِکوفہ، خاکِ مزار یا خاکِ شفا، وقتِ عصر، چادرِ سر، عزا، مجلس اور اس جیسے کئی دیگر استعارات و اشارات کا معدن کربلا کے سوا کچھ اور قرار نہیں دیا جاسکتا۔

صنفِ مرثیہ کا تشخص

جدید تنقیدی بصیرت کی رُو سے مرثیہ گوئی کو فن شاعری کا سب سے حساس اور کٹھن عمل قرار دیا گیا ہے۔ باریک بین افراد جانتے ہیں کہ کئی اصنافِ سخن پر فنی گرفت رکھے بغیر ایک فکر انگیز اور جاندار مرثیہ نہیں کہا جاسکتا۔ شعر پر فنی گرفت کے ہمراہ جتنی فصاحتِ کلام، بلاغت، حسّاسیت اور علمی وفکری مواد پر دسترس کی ایک کامیاب مرثیہ نگار کو ضرورت ہوتی ہے اتنی سعیِ نقد کسی اور صنفِ سخن میں مطلوب نہیں ہوتی۔

مرثیہ کے اجزاء

بنیادی طور پر ایک روایتی مرثیہ اپنی ترکیب میں مندرجہ ذیل اجزاء کا حامل ہوتا ہے۔ تاہم جدید مرثیہ میں قدرے مختلف ترکیبی تجربات بھی سامنے لائے گئے ہیں۔

۱۔تمہید ۲۔چہرہ ۳۔سراپا ۴۔رخصت ۵۔آمد ۶۔رَجز ۷۔جنگ ۸۔شہادت ۹۔دعا

ہیئتِ مرثیہ

مرثیہ کی صنف کو شعری ہیئت کے لحاظ سے قطعات، مسدّس اور مخمس کی صورت میں لکھنے کا رواج دبستانِ لکھنؤ کے مشاہیر نے قائم کیا تھا۔ سن ۱۲۴۹ ہجری میں میرانیس کی ولادت [یعنی ۱۲۶۴ ہجری] سے پہلے اُن کے والد کے ایک ہم عصر شاعر میر ضمیر کے ایک مسدس میں یہ دعویٰ موجود ہے کہ مرثیہ کو مروجہ ہیئت میں لکھنے کی طرح انہوں نے ڈالی۔

دکن میں مرثیہ کی عمومی صورت نوحہ اور مثنوی سے مماثل تھی۔ بعدازاں ہر دبستان میں مرثیہ برنگِ سلام کہنے کی تحریک بھی نظر آنے لگی۔ قدیم سلام کے برعکس جدید سلام میں واقعہ نگاری کی جگہ نتائج اور احساساتِ لطیف کو جگہ دی جاتی ہے۔ اسی لیے موجودہ عہد میں سلام نے غزل سے ترکیبی مماثلت کی بنا پر زیادہ کشش کے ساتھ مقبولیت حاصل کی ہے۔

میرانیس کا تعارف

میرانیس کا نام ببر علی اور انیس تخلص تھا۔ ان کے والد میر مستحسن خلیق اور دادا معروف مثنوی سحر البیان کے خالق میر غلام حسین حسن تھے۔ انیس کی ولادت سن ۱۸۰۱ء میں فیض آباد میں ہوئی اور وفات سن ۱۸۷۴ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ عربی، فارسی، قرآن وحدیث وتاریخ کے علاوہ فنونِ شہسواری وسپہ گری کی تعلیم بھی لکھنؤ کے نامی اور لائق اساتذہ سے پائی۔ فارسی نظم و نثر لکھنے پر بھی قادر تھے۔ لڑکپن ہی سے شعر کہنے لگے۔ شعر میں اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔ پہلے حزیں تخلص تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ کی فرمائش پر تبدیل کرکے انیس اختیار کیا۔ اس خاندان میں شاعری کئی پشتوں سے چلی آتی تھی۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ میر امامی شاہجہان کے عہد میں ایران سے ہند میں آئے تھے اور اپنے علم وفضل کی بنا پر اعلیٰ منصب پر متمکن تھے۔ ان کی زبان فارسی تھی لیکن ہندوستانی اثرات کے سبب دو نسلوں کے بعد ان کی اولاد فصیح اردو زبان بولنے لگی۔ میرانیس کے پردادا اور میر حسن کے والد میر غلام حسین ضاحک اردو کے صاحبِ دیوان اور غزل گو شاعر تھے۔ گویا میرانیس کے گھرانے کی اردو شاعری کا معیار تین نسلوں سے متقاضی تھا کہ وہاں میر انیس جیسا صاحبِ سخن پروان چڑھے اور تا قیامت اہلِ ادب اُسے "خدائے سخن" کے نام سے پکارتے رہیں۔

انیس غزل سے مرثیہ تک

میرانیس ابتدا میں غزل کہتے تھے مگر والد کی نصیحت پر صرف سلام اور مرثیہ کہنے لگے اور پھر ایسے منہمک ہوئے کہ کبھی غزل کہنے پر توجہ ہی نہیں دی۔ محمد حسین آزاد نے کیا خوبصورت تبصرہ فرمایا ہے کہ "والد کی فرمانبرداری میں غزل کو ایسا چھوڑا کہ بس غزل کو سلام کردیا۔ ناصر لکھنوی نے خوش معرکہءزیبا [مرتبہ مشفق خواجہ کراچی] میں لکھا ہے کہ غزلیں انہوں نے دانستہ ضائع کردی تھیں مگر پندرہ سولہ غزلیں جو محققین کو دستیاب ہوئی ہیں وہ انیس کی غزل گوئی پر فنی قدرت کی واضح ترین دلیل ہیں۔ چند شعر دیکھیے

شہیدِ عشق ہوئے قیسِ نامور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح
کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح
ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح
انیس یوں ہوا حالِ جوانی و پیری
بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

یہ اشعار بھی دیکھیے ـــــ

نزع میں ہوں مری مشکل کرو آساں یارو
کھولو تعویذِ شفا جلد مرے بازو سے

....

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

لکھنوی ماحول اور انیس

مرثیہ کی میراث انیس کو اجداد سے منتقل ہوئی تھی مگر ان کی طبعِ رواں ذاتی لیاقت کربلا سے ایمانی وابستگی اور شاہانِ اودھ کے عہد حکومت میں لکھنؤ کے اندر عزاداری کے لیے مثالی ماحول کی دستیابی نے انیس کو مرثیہ نویسی اور مرثیہ خوانی کے فن میں طاقِ روزگار بنادیا اور کچھ ہی عرصہ میں انیس نے سلاستِ زبان، ادائیگی اور حسنِ بیان میں اپنے عہد کے راسخ البیان مرثیہ گو استاد جناب میرزا سلامت علی دبیر اور دیگر اساتذہءفن کو بھی مقبولیت میں قدرے پیچھے چھوڑ دیا۔ انیس کا معمول تھا کہ شب بھر جاگتے اور مطالعہ وتصنیف میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے پاس دو ہزار سے زائد قیمتی اور نایاب کتب کا ذخیرہ موجود تھا۔ نمازِ صبح پڑھ کر کچھ گھنٹے آرام کرتے تھے۔ بعدِ دوپہر بیٹوں اور شاگردوں کے کلام کی اصلاح کرتے تھے۔ محفلِ احباب میں عقائد اور علوم وعرفانیات پر گفتگو کرتے تھے۔

مراثیِ انیس کی تعداد

میر ببر علی انیس کو دشت کربلا کا عظیم ترین سیّاح قرار دیا گیا ہے۔ اُن کے مرثیوں کی تعداد بارہ سو کے لگ بھگ

بیان کی جاتی ہے۔ ''مجلّہ نقوش انیس نمبر'' میں بہ تحقیقِ عمیق میر انیس کے ۲۶ نایاب اور غیر مطبوعہ مراثی طبع کیے گئے ہیں۔ محققین کے مطابق ان کے کئی مرثیے ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں مختلف بیاضوں کے اندر موجود ہیں۔ میر انیس نے روایتی مرثیہ کے علاوہ سلام، قصائد، نوحہ اور رباعیات کا بھی کثیر ذخیرہ چھوڑا ہے۔ رباعیاتِ انیس کی تعداد محققین کے مطابق چھ سو کے برابر ہے۔ میر انیس کے کئی مراثی میں معجزاتی کرشمہ کاری کا عنصر ملتا ہے۔ آپ کے ایک نواسے میر عارف کی تحریری یادداشت سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے اواخر میں میر انیس نے ایک سوستاون بند یعنی ایک ہزار ایک سو بیاسی مصرعوں کا یہ شاہکار مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' ایک ہی شب میں لکھا اور اپنے خاندان کے عشرۂ مجالس میں پڑھا۔ انیس نے حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السّلام کے بے نُقط خُطبہ کی تآسی میں کچھ ایسے مرثیے بھی لکھے جو بے نُقط تھے۔ میر انیس کے تین فرزندان تھے میر نفیس، میر جلیس اور میر سلیس اور یہ تینوں منجھے ہوئے شاعر و مرثیہ نگار تھے۔ والد کے بعد میر نفیس کا مرثیہ اعلیٰ پائے کی مرثیہ نگاری میں شمار ہوا ہے۔

میر انیس کے مرثیوں کا مختصر فنّی جائزہ

جنابِ انیس کے رقم کردہ مرثیے اب تک کروڑوں آنکھوں، زبانوں اور سماعتوں کو اپنے ملکوتی خصائل کا گواہ بنا چکے ہیں۔ انیس کے کہے ہوئے مرثیوں میں آیات و روایات ، تاریخ، تخیّل، ماحول، سراپا، رَجز، مبارزت طلبی، مظلومیت، آہ و بکا، مکالمات ، اعداد و شمار، منطق و فلسفہ، علومِ جہانی اور اصول و عقائد کے مفاہیم کی ایسی متوازن آمیزش ملتی ہے کہ انیس کے علم و فضل کی وسعتیں بیکراں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ انیس نے دبیر کے مقابلہ میں سلیس زبان استعمال کی۔ اس کے باوجود اردو ادب کے محققین کے مطابق طولِ تاریخ میں تراکیب و فرہنگ کا سب سے عظیم ذخیرۂ الفاظ میر انیس کے کلام میں ملتا ہے۔ عروض و قوافی ، صرف و نحو، تراکیب، صنائع و بدائع، محاکات، محاورات اور بندشیں ان کے یہاں دست بستہ نظر آتے ہیں۔ مرثیہ بیانیہ شاعری کا نام ہے۔ انیس نے اس میں ایک ناظر کی حیثیت سے خارجی اندازِ ملاحظہ اور مرثیہ کے کرداروں کی اپنی داخلی کیفیات کو بیک وقت یک جا کر کے واقعہ نگاری کو معجزاتی انداز تک متحرّک اور بے نظیر بنا دیا ہے۔ میر انیس کا اجتماعی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مرثیہ نگاری کو ایک سماجی رسم کے درجہ سے اٹھا کے نفیس ترین ادبی صنف اور مرثیہ گوئی کو فنِ لطیف میں بدل دیا ہے۔

میر انیس ایک اعلیٰ سخنور ہونے کے علاوہ نہایت خوش آواز بھی تھے۔ نقوش کے میر انیس نمبر میں روایت نقل ہے کہ لکھنؤ کے ایک بزرگ سید محمد جعفر مرثیہ خوان تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''میں نے بچپن میں میر انیس کو بارہا مرثیہ خوانی کرتے ہوئے سنا ہے۔ انیس کی آواز میں جو دلکشی تھی وہ کسی انسان کا تو کیا ذکر، کسی خوش الحان پرند اور باجے کی آواز میں بھی نہیں ہے۔ جب کبھی وہ بے تکلّف احباب کی صحبت میں بند کمرے کے اندر اپنے دادا میر حسن کی مثنوی پڑھتے تھے تو راہ گیر کھڑے ہو کے دیر دیر تک سنا کرتے تھے۔''

منبر پہ مرثیہ تحت اللفظ پڑھنے میں بھی میر انیس کی مثل کوئی دوسرا نہ بن سکا۔ انیس پر لکھی گئی کتب میں اس شانِ ادائیگی کا تذکرہ کئی راویوں کی زبان سے نقل ہوا ہے۔ کتاب ''واقعاتِ انیس'' میں علی مرزا پٹنے کا بیان ہے کہ وہ انیس کے متواتر سننے والوں میں سے تھے اور انیس بہ کمالِ توجّہ منبر سے انہیں مخاطب بھی کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

''جب وہ مرثیے کا کوئی مقام رقّت انگیز پڑھتے تھے تو جوشِ رقت میں خود بھی بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ ضبطِ گریہ کی غرض سے نیچے کے ہونٹ کو دانتوں سے دبا لیتے تھے جس سے داہنی جانب کا رخسار متحرّک ہو جاتا تھا''۔

مولانا محمد حسین آزاد نے انیس کو لکھنو میں خود دیکھا تھا۔ آبِ حیات میں انہوں نے انیس کے لیے لکھا ہے:

''کمال اور کلام کی کیا کیفیت بیان کروں۔ محویت کا عالم تھا وہ شخص منبر پر بیٹھا پڑھ رہا تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے۔ انیس کی آواز، اُن کا قد و قامت اُن کی شکل و صورت کا انداز غرض ہر شئے مرثیہ خوانی کے لیے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی۔''

مولوی عبدالحلیم شرر ''گزشتہ لکھنو'' میں لکھتے ہیں کہ:

''میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیوں کے بعض مقرّروں کی نسبت سنا جاتا ہے کہ وہ آواز کے نشیب و فراز اور اوضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو میں جادوئی اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اِس طولانی عمر میں اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیس نے زندہ کیا ہے''۔

☆☆☆☆

رئیس فاطمہ

سید انشاء اللہ خاں انشاء

''کلیلہ ودمنہ'' ایک بہت مقبول اور مشہور کلاسیکی داستان ہے۔ جس میں دو گیدڑوں کی زبانی نہایت دلچسپ اور سبق آموز قصے بیان کیے گئے ہیں۔ کلیلہ نامی گیدڑ میں ایک بے نیازی اور قناعت تھی، وہ جھوٹ اور فریب سے نفرت کرتا تھا۔ جب کہ دمنہ نہایت چالاک، چاپلوس، خوشامدی اور موقع پرست تھا۔ اور اسی خصوصیت کی بناء پر وہ جنگل کے بادشاہ شیر کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا تھا۔ دمنہ کی خواہشوں کو دیکھتے ہوئے کلیلہ اسے نصیحت کرتا ہے کہ بادشاہوں کا مصاحب بننے میں فائدے تو بہت ہیں، لیکن یہ خطرے سے خالی نہیں کیونکہ جب صاحب اقتدار جلال میں آتے ہیں تو ساری چالیں الٹی پڑ جاتی ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ''حاکم کی نہ اگاڑی اچھی نہ پچھاڑی''۔ ''کلیلہ ودمنہ'' کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے نجانے کیوں اردو کے صف اول کے نام ور شاعر سید انشاء اللہ خاں انشاء کا خیال آتا ہے، جن کی دو نثری تصانیف ''دریائے لطافت'' اور ''رانی کیتکی کی کہانی'' اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ بھارت میں کچھ لوگوں نے جن میں سجاد ظہیر بھی شامل تھے ''سنہرے ورق'' کے نام سے ٹیلی ویژن کے لیے ایک سیریل بنائی تھی جس میں اردو کے کلاسیکی شعراء کی حقیقی زندگی کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ یوں تو ہر پروگرام بہت معلوماتی اور منفرد تھا۔ لیکن بطور خاص ولی گجراتی اور انشاء والے دونوں پروگرام اس سلسلے کے بہترین پروگرام کہے جاسکتے ہیں۔ خاص کر انشاء کی حقیقی زندگی بالخصوص آخری عمر کے تکلیف دہ لمحات کو جس سچائی اور خلوص سے فلمایا تھا، اس نے ہر اس آنکھ کو اشکبار کردیا تھا، جو وہ پروگرام دیکھ رہی تھی۔ کتنا بڑا شاعر، محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں اس انسان کا تفصیلی ذکر کیا ہے' ایک جگہ لکھتے ہیں ''ایسا طباع اور عالی دماغ انسان ہندوستان میں کم پیدا ہوا ہوگا، وہ اگر علوم میں سے کسی ایک کی طرف متوجہ ہوتے تو صدہا سال تک وحید عصر گنے جاتے، طبیعت ایک ہیولیٰ تھی کہ ہر قسم کی صورت پکڑ سکتی تھی۔''

مرشد آباد سے جب دلی آئے تو دربار سے وابستہ ہوگئے۔ طبیعت میں شوخی اور جولانی دونوں تھیں۔ اس لیے لطائف اور چٹکلے بھی خوب سناتے تھے، غزل، قصیدہ، ہجو سب کے بادشاہ تھے۔ گل افشانی کرکے محفل کو لوٹ پوٹ کردیتے تھے۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شاہ عالم کو ان کی جدائی گوارا نہ تھی۔ لیکن باوجود، زبان کی طراری، محاوروں اور تراکیب کا بانکپن، طبیعت کی شوخی، زبان پر قدرت اور نئی نئی تراکیب وضع کرنے کے' دلّی والوں نے سید انشاء کو زیادہ منہ نہ لگایا۔ ذہین آدمی تھے بھانپ گئے' آخر دلی سے جی اچاٹ ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب غلام قادر روہیلہ شاہ عالم کا نقدِ بصارت نکال کرلے گیا تھا۔ سید انشاء لکھنؤ آ گئے اور لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہوکر ان کے کلام پر اصلاح بھی دینے لگے۔ بعد میں نواب سعادت علی خاں نے انشاء کے فضل وکمال کی شہرت سن کر انہیں اپنے دربار سے وابستہ کرلیا اور دونوں ایسے شیر وشکر ہوئے کہ نواب کو انشاء کے سوا کسی کی صحبت میں مزہ نہ آتا تھا۔ دربار داری کے



ساتھ ہر دم کی مصاحبت بھی اور اسی مصاحبت نے ان کی زندگی ایک عذاب بنادی اور ہنسی ہنسی میں ایسی مخالفت پیدا ہوگئی کہ دیکھنے والے عبرت پکڑتے تھے۔ ایک چہکتے ہوئے بلبل کو پنجرے میں قید کردیا گیا تھا۔ آزاد لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی مختلف زبانیں ان کے گھر کی لونڈی ہیں، ابھی پنجاب میں کھڑے ہیں، ابھی پورب میں بیٹھے باتیں کرتے ہیں، ابھی برج بھاشی ہیں، ابھی مرہٹے، ابھی کشمیری، ابھی افغان، سب زبانوں میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔'' لیکن ایسے صاحب کمال کو مصاحبت اور زود گوئی لے ڈوبی۔ اور وہ کہاوت سچ ہوگئی کہ حاکم کی اگاڑی اور پچھاڑی دونوں خطرناک ہوتی ہیں۔ نہال ہوئے تو موتی لٹادیے، خزانے بخش دیے اور ناراض ہوئے تو پھانسی پہ لٹکوادیا' انشاء کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک دن نواب سعادت علی خاں کے دربار میں محفل سجی تھی' انشاء بلبل کی طرح چہک رہے تھے اور نواب صاحب کے ساتھ ساتھ اہل محفل بھی خوب لطف اندوز ہو رہے تھے' بعض خاندانی شرفاء کے شرافت ونجابت کے تذکرے ہو رہے تھے۔ سعادت علی خان نے کہا کیوں بھئی! ہم بھی نجیب الطرفین ہیں؟ اب اسے تقدیر کہا جائے یا زود گوئی کا نتیجہ کہ انشاء بول اٹھے۔ حضور نجیب الطرفین نہیں بلکہ انجب......! بس غضب ہوگیا' کیونکہ سعادت علی خاں ایک لونڈی کے بطن سے تھے اور ''انجب'' کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک لونڈی زادے کے اور دوسرے جو ماں باپ اور خاندان ہر طرف سے اس کا نسب اعلیٰ ہو۔ سعادت علی خاں چونکہ لونڈی کے بطن سے تھے اس لیے انہوں نے سمجھا کہ سید انشاء نے ان پر چوٹ کی ہے۔ جب کہ ان کا یہ مطلب نہ تھا۔ لیکن اسی دن سے سعادت علی خاں نے دل میں کینہ پال لیا۔ اور موقع تلاش کرنے لگے کہ کسی طرح انشاء کو زچ کیا جائے۔ اب نواب کے انداز بدلنے لگے۔ انشاء نے بہتیرا چاہا کہ ان کے دل سے یہ کانٹا نکل جائے، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ ایک دن پھر اسی زود گوئی کے سبب انشاء نے خود اپنی بربادی کا سامان مہیا کردیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن انشاء نے نواب کو ایک بہت بھڑکتا ہوا لطیفہ سنایا۔ نواب نے کہا۔ انشاء جب کہتا ہے ایسی ہی بات کہتا ہے کہ نہ دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ انشاء جذبات میں آ کر بولے۔ حضور کے اقبال سے قیامت تک ایسے ہی کہے جاؤں گا کہ نہ دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ نواب تو تاک میں تھے فوراً بولے' بس زیادہ نہیں فقط دو لطیفے روز سنادیا کیجیے۔ مگر شرط یہی ہے کہ نہ دیکھے ہوں نہ سنے ہوں۔ نہیں تو خیر نہ ہوگی۔ انشاء سمجھ گئے کہ یہ انداز کچھ اور ہیں۔ اس دن سے بازاروں میں پاگلوں کی طرح پھرتے تھے اور ایک ایک سے کہتے تھے کہ کوئی نیا لطیفہ سنادو۔ پھر ''مرے پہ سو درّے'' یہ ہوا کہ ایک دن نواب نے انہیں بلوایا مگر یہ کہیں اور گئے ہوئے تھے۔ نواب کو جب پتہ چلا کہ وہ کسی اور امیر کے ہاں گئے تھے تو فوراً بلوایا اور حکم دیا کہ ہمارے علاوہ کسی اور کے ہاں مت جایا کرو۔ اور ان کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگادی۔ اسی دوران انشاء کا جوان بیٹا مرگیا۔ اس صدمے سے حواس مختل ہوگئے۔ پھر نواب نے ان کی تنخواہ بھی بند کردی۔ نواب سعادت یار خاں رنگین انشاء کے جگری یار تھے۔ آزاد نے ان کے حوالے سے انشاء کے کئی دلخراش واقعات نقل کیے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ رنگین لکھنؤ میں ایک سرائے میں ٹھہرے تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہو رہا ہے، یہ بھی جا کر شریک ہوگئے۔ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے' مشاعرہ شروع نہیں ہوا تھا کہ دیکھا ایک شخص میلی کچیلی روئی کی مرزئی پہنے آیا اور سلام کرکے بیٹھ گیا اور پوچھا کہ مشاعرہ کیوں نہیں ہوا؟ تو لوگوں نے کہا ابھی لوگ اور جمع ہو جائیں تو شروع ہوگا۔ وہ بولے صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھے دیتے ہیں یہ کہہ کر غزل نکالی اور کاغذ پر دیکھ کر پڑھنی شروع کردی۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبرو تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں روپیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بے کار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے

یہ مشہور غزل پڑھ کر کاغذ پھینک کر سلام کر کے چلے گئے' مگر زمین و آسمان میں سناٹا چھا گیا۔ مقطع سے پتہ چلا کہ یہ سید انشاء تھے۔

رنگین نے بھی غزل سن کر انہیں پہچانا۔ حال معلوم کیا تو بہت دکھی ہوئے۔ پھر آخری بار جب ان کے گھر گئے تو دیکھا جس دروازے پر ہاتھی جھولتے تھے وہاں خاک اڑ رہی ہے اور کتے لوٹ رہے ہیں۔ رنگین اندر گئے تو ان کی بیوی نے بتایا کہ ان کی عجب حالت ہے۔ دیکھا تو ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ سر زانو پر رکھا ہے' آگے راکھ کا ڈھیر تھا۔ ایک ٹوٹا ہوا حقہ پاس رکھا تھا۔ کہاں وہ شان و شوکت' کہاں یہ حالت جو دیکھی نہ جاتی تھی۔ رنگین دیر تک دوست کی حالت دیکھ کر روتے رہے اور پوچھا: ''انشاء! کیا حال ہے؟'' انہوں نے سر زانو پر رکھ لیا اور پھر کبھی نہ اٹھایا۔

اتنا قادر الکلام شاعر جس نے ہر صنف سخن میں لاتعداد شعر کہے' دو غزلہ اور سہ غزلہ کہا۔ نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت اسے برباد کر گئی۔ انشاء اللہ خاں انشاء کی شاعری اور قابلیت کو نواب کی مصاحبت لے ڈوبی۔ شاید داناؤں کا کہنا صحیح ہے کہ زیادہ بولنا مصیبت کو دعوت دیتا ہے۔ اور بے سوچے سمجھے بولنا زندگی عذاب بنا دیتا ہے۔ کہتے ہیں پانی ہمیشہ نشیب میں مرتا ہے۔ اسی لیے نواب نے ''انجب'' کے معنی وہ لیے جن کا خیال بھی انشاء کو نہ تھا، لیکن چونکہ وہ حرم کے پیٹ سے تھے اس لیے انہوں نے ''انجب'' کے وہی معنی لیے جو ان کی اصل تھے۔ تاریخ میں اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جب لیاقت و قابلیت کو اہل اقتدار کی صحبت و قربت لے ڈوبی، لیکن آج بھی بڑے بڑے دانشور' اہل اقتدار کے لیے قصیدے لکھتے ہیں اور داد پاتے ہیں۔☆☆☆☆

ہمارا موجودہ معاشرہ منٹو کی تحریروں کے آئینے میں

افشاں کرن

سعادت حسن منٹو ایک منفرد افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اردو ادب کی افسانہ کی صنف کو انھوں نے جس بلندی و عظمت تک پہنچایا شاید ہی کوئی افسانہ نگار پہنچا سکا ہو۔ موضوعات کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے الگ پہچان کے حامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں افسانے کے فطری تقاضے پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ تکنیک، ہیئت، موضوع کی باریکیوں اور بے پناہ حقیقت نگاری کی بدولت جب وہ افسانہ تحریر کرتے تو ایک شاہکار قاری کے سامنے آتا۔ ان کا افسانہ نفسیات اور ادب کا حسین امتزاج ہوتا تھا۔

منٹو کے افسانوں میں حقیقت نگاری موجود ہے اور حقیقت نگاری بھی وہ جو منفی رخ رکھتی ہے انھوں نے سماج کی ڈھکی چھپی برائیوں، تہہ در تہہ پڑی ہوئی برائیوں، خرابیوں معاشرے کی تعفن زدہ حقیقتوں کو بیان کیا، بہت زیادہ سچائی اور حقیقت لکھنے کی بدولت ان کی تحریروں میں فحاشی بھی در آئی جس کی وجہ سے ان پر فحش نگاری کا مقدمہ بھی چلا مگر وہ مسلسل حقیقت بیان کرتے رہے۔ جب ان سے سوالات پوچھے جاتے کہ وہ سچائی اور حقیقت لکھنے کے نام پر معاشرے میں فحاشی اور بے حیائی پھیلا رہے ہیں اور تہذیب و تمدن کو ملحوظ رکھ کر افسانے تحریر نہیں کرتے تو انھوں نے ''لذت سنگ'' اپنے افسانوں کے مجموعہ کے دیباچ میں بیان کیا:

''لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختہ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختہ سیاہ کی سیاہی اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے''۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانوں ''کھول دو''، ''ٹھنڈا گوشت'' جیسے افسانوں میں بہت سی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی انسانی نفسیات کی گرہیں کھولی ہیں۔ بنیادی طور پر ادب اور نفسیات کے امتزاج سے ہی ایک ادبی شاہکار تخلیق ہوتا ہے۔ اس ادب میں نفسیات کا کون سا رخ کتنی گہرائی سے بیان کیا گیا ہے اور نفسیات کی کن کن الجھنوں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ باتیں ادب کو عظیم یا گھٹیا بناتی ہیں۔ اس طرح منٹو ایک عظیم افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات پر عبور رکھنے والا شخص تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ''ٹھنڈا گوشت'' جیسا عظیم افسانہ کبھی تخلیق نہ ہوتا۔

ہمارا مقصد منٹو کی تحریروں کو خراج تحسین پیش کرنا نہیں بلکہ ان کی تحریروں کی روشنی میں موجودہ معاشرہ کو دیکھنا ہے۔ منٹو نے جس دور میں افسانہ نگاری کی وہ چالیس اور پچاس کی دہائی تھی۔ اس دور میں وہ تمام معاشرتی برائیاں، طبقاتی اونچ نیچ، مکار اور مجبور، ظالم و مظلوم، رحمدل و انتہائی سنگدل افراد، مجبور و لاچار عورتیں سب اس معاشرے کا حصہ تھے، جہاں کچھ پر ظلم ہو رہا تھا اور جہاں بعض مظلوم مختلف مجبوریوں کی بنا پر وہ ظلم سہہ رہے تھے اور رحمان کے روپ میں شیطان سب افراد موجود تھے۔ منٹو نے ان کے عمدہ اور بہترین خاکے اپنے افسانوں میں پیش کیے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں جس معاشرے کی تصویر صفحہ قرطاس پر لفظوں کی مدد سے بنائی وہ قابل رحم اور عبرت حاصل کرنے والا تھا اس معاشرے میں عورت کی بے بسی، اس کی چھپی ہوئی چالاکی کو بہت ہی بہترین انداز میں بیان کیا۔ اس نے عورت کے بے شمار روپ اور انسانیت کے مکروہ چہرے اتنی تفاوت سے بنائے کہ ہر دیکھنے والے کو اپنا چہرہ اس آئینے میں صاف نظر آنے لگا۔ وہ مکروہ تھا یا قابل رحم یہ ہر دیکھنے والے کا ضمیر جانتا تھا۔ اس شخص نے ایسے معاشرے کی تصویر پیش کی تھی۔ جہاں مظلوم عورتیں، سنگدل عورتیں نیز دلال، ظالم اور مجبور وفادار لوگ رہتے تھے۔ منٹو نے جس معاشرے کی تصویر پیش کی یوں محسوس ہوتا ہے وہ پورا معاشرہ اب صفحات سے نکل کر حقیقت میں ہمارے سامنے آ گیا ہے اور ہم بھی اس معاشرے کے فرد کی حیثیت سے وہاں موجود ہیں، جہاں ظلم ہوتے دیکھ رہے ہیں مگر چپ اور لاچار ہیں۔ وہ معاشرہ اندھیرے میں ڈوبی، سیم زدہ کتابوں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔

یہ منٹو کی عظمت ہے یا اس کا جنس سے گہرا لگاؤ کہ اس نے نہایت ہی اعلیٰ انداز میں اتنے گھناؤنے واقعات، حادثات اور ظالموں کے ظلم کو بیان کیا ہے کہ روح کانپ اٹھتی ہے۔ کوئی سچائی بیان کرنے والا یا تو بہت ہی رحم دل ہوتا ہے یا پھر انتہائی سنگدل۔ رحم دل یوں کہ اس ظلم کا اس سچائی کا ادراک کیا اور سنگدل اس طرح کہ کتنی مضبوطی اور دل کو پتھر بنا کر اس حقیقت کو بیان کر دیا۔ سچائی لکھنے والا ہی جانتا ہے کہ وہ انتہائی

حساس ہے اور دوسروں کا احساس کر کے وہ سچائی بیان کر رہا ہے یا انتہائی سخت دل ہے کہ اس سچائی کو جسے جان کر، پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور روح لرز جائے بیان کر رہا ہے۔ ایک مصنف میں جب یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں تو وہ ایک مشکل اور معمہ بن جاتا ہے اور منٹو ایک ایسا ہی شخص تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو اردو ادب کا ایک متنازعہ افسانہ نگار ہے۔

وہ حقیقت جو منٹو نے آج سے ۵۰، ۶۰ سال پہلے بیان کی تھی اس معاشرے کا اب کوئی ڈھکا چھپا سچ نہیں رہا بلکہ نہایت نمایاں ہو چکا ہے اور نمایاں ہونے کے بعد اپنے اندر رکھنے والی عبرت بھی کھو چکا ہے۔ اب ان سچائیوں کا معاشرے کے افراد پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اُنھیں عبرت بھی حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ ان حقیقتوں کا حصہ بننے سے کتراتے ہیں۔ نہ کوئی شرمندہ کرنے والا رہا ، نہ کوئی شرمندہ ہونے والا بشر موجود ہے۔ اس سچائیوں کو سرِ عام ٹی وی چینلوں، اخبارات میں لکھا، پڑھا اور دیکھا جا رہا ہے۔ یہ معاشرے کی تباہی اور تزلزل کی نشانی ہے کہ عبرت حاصل کرنے والی چیزوں کو مزید پرلطف اور پرلذت بنا کر پیش کیا جائے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا اخلاقیات کے تقاضے بھی بدلتے گئے۔ منٹو کی تحریروں میں جس معاشرے کی عکاسی کی گئی وہ اپنے دور کی انتہائی ڈھکی چھپی برائیاں تھیں مگر موجودہ دور میں وہ برائیاں ڈھکی چھپی نہیں، نہ ہی وہ معاشرے کا ناسور ہیں بلکہ تفریح کی صورت اختیار کر چکی ہیں نہ ان برائیوں کو بیان کرنے سے اب یہ معاشرہ تعفن زدہ ہوتا ہے۔

منٹو نے انتہائی بے باک اور سچائی سے معاشرے کے سات پردوں میں چھپے ہوئے المیوں، گناہوں کو اس وقت بیان کیا جب سب اس کی تحریروں کو فحاشی سمجھنے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ اس دنیا میں آنے والے صاحب فہم و ادراک وقت سے پہلے حقیقت کو سمجھ کر بیان کر دیتے ہیں۔ جب ان کی بات کو صحیح معنوں میں سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا میری نظر میں منٹو ایک ایسا ہی شاہکار خداوند تھا جس نے معاشرے میں پھیلنے والی گندگی، ناسور کے دھارے کو وقت سے بہت پہلے دیکھ لیا تھا اور جان گیا تھا کہ کچھ سالوں کے بعد یہ ناسور معاشرے میں پھیل کر کیسے مفلوج کر دے گا۔ اس نے سات پردوں میں مرتکب ہونے والے گناہوں اور گنہگاروں کا ادراک کر لیا تھا۔ یہ اس کی بڑائی تھی کہ اس نے خطرے کی سرخ بتی جلائی کہ سب محتاط ہو جائیں مگر بدقسمتی سے اس نشاندہی کرنے والے کو ہی مجرم سمجھ لیا گیا اور اب چند دہائیوں کے بعد موجودہ معاشرہ مکمل طور پر منٹو کے بیان کیے ہوئے سیاہ معاشرے کی عمدہ اور کامل مثال بن چکا ہے۔

☆☆☆☆

جمال ابڑو

اردو ترجمہ: ستار پیرزادہ

مانگ

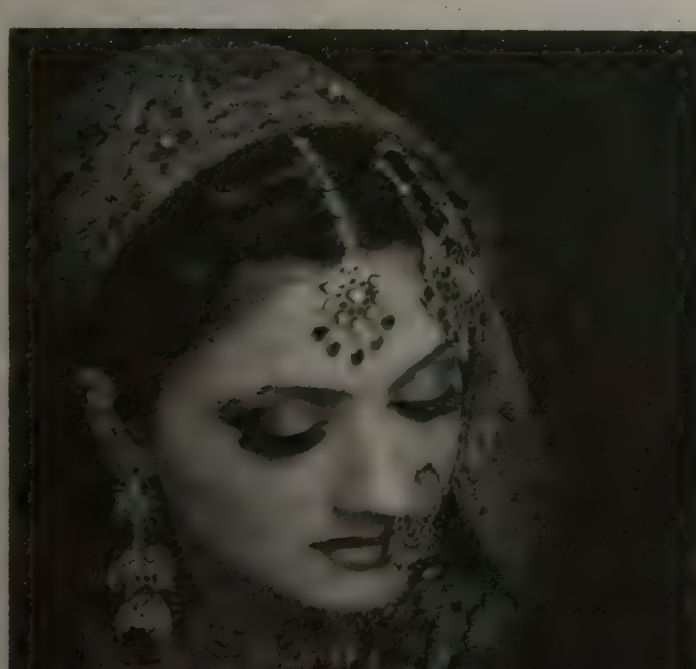
تعارف

محترم جمال ابڑو، سندھی افسانوی ادب کی وہ روشنی ہے، اس کی افسانوی دنیا جتنی مختصر ہے، اس سے کہیں زیادہ ان کی روشنی کا پھلاؤ ہے جو آج تک سندھی نوجوان لکھاریوں کے لئے راہوں کو روشن کیے رکھتا ہے، جیسے ایک چھوٹا سا جگنو گھپ اندھیرے کی گہرائی میں روشنی کا پیامبر ہوا کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اس صنف پہ بہت کم لکھا لیکن ان کا ہر ایک افسانہ سندھی تہذیب و ثقافت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

جمال ابڑو نے ۲ مئی ۱۹۲۴ء کو 'سانگی' نامی ایک گاؤں کے محلہ تعلقہ میہڑ میں علی خان ابڑو کے گھر میں آنکھیں کھولیں۔ دورانِ تعلیم وہ علامہ مشرقی کی تحریک، خاکسار تحریک سے وابستہ ہو گئے اور عمر بھر اس سے منسلک بھی رہے۔ جمال ابڑو تعلیم پوری کرنے کے بعد پیشۂ وکالت سے منسلک ہو گئے اور پھر پراسیکیوٹر جج، دو بار سیکریٹری سندھ اسمبلی، جج لیبر کورٹ، ممبر فیڈرل سروسز ٹریبونل، رجسٹرار اور آخر میں چیئرمین اینٹی کرپشن اینڈ انکوائریز ونگ سندھ بھی رہے، اور اسی عہدے سے ۱۰ اپریل ۱۹۸۴ء کو ریٹائرمنٹ حاصل کرنے کے بعد فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ جمال ابڑو ۸۰ برس کی عمر میں اپنے پیچھے سات اولاد میں سے بدر ابڑو کو اپنے لکھنے کی مسند پر براجماں دیکھ کر، سندھی ادب، ادباء و اقرباء کو خیرباد کہہ کر ہماری آنکھوں سے تو دور ہو گئے لیکن ہمارے دلوں میں ہمیشہ کے لئے اپنا مسکن بنا گئے۔ ان کے ایک سندھی افسانے کا اردو ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔

سرکاری ہسپتال کھپرو کے مردہ خانے کے سامنے لوگوں کا جمگھٹا، دھول مٹی میں لت پت بال، چوٹی اور مانگ بھی، دھول اور ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اندر خاکروب، ڈاکٹر، مکھیوں کی بھن بھن۔ سندھ جنی، کسی کی لاج سب کا ناموس، کئی اجنبیوں کے سامنے اس کی لاش ننگی پڑی تھی۔ ٹیڑھے ہاتھ، زخمی پاؤں، حیران آنکھیں، حسرت و ہیبت سے پھٹی آنکھیں، نیک سیرت، رحمدل، سلیقہ شعار، کوئنرو یا سوہنی۔ پیار کی راہ میں ایک اور قربانی کتنا قبول کیا مانگ کا وعدہ نہ ٹالا۔ ہنستے ہنستے مانگ پر ہاتھ رکھ کر انجام دیا، قہقہ کلہاڑی کی گرج میں بدل گیا، انگلیاں کٹ چکیں، مانگ اجڑ گئی۔ وہیں ان کا بھائی بھی کھڑا تھا۔ ماں کے خون سے پیدا ہوا، اس کے دودھ پہ پلا بڑھا، جس کے لیے بچپن سے ہی کہتی 'اللہ دے گا بھیا کو۔۔۔' گاتی تھی۔ پھر اسی بھائی نے غیرت میں آ کر بہن کو قتل کر دیا، ہتھکڑیاں پہن کر بھی سر اونچا کیے کھڑا تھا، جیسے قلعہ فتح کیا ہو۔

ماں تھی، جس کی رازدار آج کلہاڑی سے، زخموں سے چھلنی ہو چکی تھی، جس نے بیٹی کی کچی پھیکی چھپائی تھیں، جس نے بار بار انہیں سمجھایا اور سمجھا تھا۔ ان کا بھدے پاؤں والا شوہر، جو پنجوں پر چلتے لڑکھڑا رہا تھا، ادھر ادھر دیکھتا چل پھر رہا تھا، بولتا تھا تو رال ٹپکنے لگتی، بار بار مردہ خانے کو گھورتا۔ چیختا رہا، "اللہ میری سوہنی پانچ ہزار کی تھی۔" "بیلوں کا جوڑا، دو جریب زمین اور عورت کی جان، وہ جان جس میں ناچتی، کودتی، تیرہ برس کی دوشیزہ، پیدائش سے موت تک گھٹتی رہی۔ کھیل کود، سہرے گاتی، سب کچھ اسی جال میں، سانس گھٹ گھٹ کر، نچوڑ سی گئی، آخرکار گم ہو گئی۔ "اللہ دے گا بھین کو!۔۔۔" اور اللہ نے بھائی کو بیلوں کا جوڑا اور دو جریب زمین دے دی۔ بہن کی جان شوہر کا حق بن گئی، زر خرید حق۔



شادی کے جوڑے، ہاتھوں پہ مہندی، چاندی کی چوڑیاں، بار بار ماں کو لپٹ جاتی، بچپنا۔ شادی کو ایسے سمجھ رہی تھی جیسے گڑیا گڈے کا کھیل۔ جب رات کو ساتھ سوئی تو آدھی رات کے بعد لوگوں نے ان کی چیخیں سنیں، تھپیڑوں کی آوازیں۔ تھکی تھکی سی، زرد، زندگی ایسی جیسی موسم گرما میں بند

ہوا۔ ہر صبح میں شام ایسی گھٹن تھی اور ہر شام صبح ایسی، تکالیف۔ رہٹ کی لوٹی کی طرح۔ گلے میں رسی بندھی ہوئی۔ کنویں میں ڈبکیاں اور رات بھر آواز رہٹ۔ دو ہزار کی کنیز۔ کھانا پکانا، جھاڑو پوچی، پانی بھرنا، گھڑے رکھنا، کپڑے دھونا، گھاس کاٹ کرلانا، کھیتی باڑی اور روزانہ زبردستی۔ اس کا عورت زاد حسن نہ پیدا ہوا اور نہ ہی مرا، نہ ابھرا اور نہ ہی ڈھلا۔ دو سال بعد جب وہ والدہ سے ملنے آئی تو دل پھٹ پڑا، بین کرتے ہوئے رو پڑی، بھائی کہہ کر اس سے لپٹ گئی، بھائی اور شوہر کے فرق کا شدت سے احساس ہونے لگا، بچوں کی ٹولیاں دیکھ کر اور زیادہ آنسو بہانے لگی۔

آبائی گھر نے اس کی روح کو راحت اور جسم کو تراوت بخشی، جس گھر کے چھپر چھاؤں، گھاسیلی دیواروں سے اس کا بچپن لپٹا پڑا تھا ان سے خود بھی لپٹ پڑی۔ ایسی سوچیں آنے لگیں کہ اب گانے لگے "نیم کی نمولی پکی، اللہ دے گا ابو کو، سونا ڈالے گا بیٹیوں کو، چاند دیکھا دودھ میٹھا۔۔۔" دل کے کسی کونے سے انگڑائی لی، ہلکی بجلی کی طرح ٹیڑھی میڑھی لکیر نمودار ہوئی اور گم ہوگئی۔ کالی گھنگھور گھٹائیں، ہلکی پھلکی ہوا، ان کے ململ کی چولی کو اس کے سینے سے سرکاتی رہی۔ عجیب انوکھی کیفیت، چولی میں سے گذر کر سینے میں سمائی جا رہی تھی۔ برکھا برسی، وہ کھڑی رہی۔ بچوں کی ٹولیاں گانے لگیں، اکھری میں ککڑا، مہینہ آیا تکڑا۔ (یہ ایک کہاوت ہے گیہوں میں سے مٹی صاف کرنے یا چاول صاف کرنے کا ایک مخصوص برتن، بارش جلد آئی) چولی بدن سے چمٹ گئی، اس نے محسوس کیا کہ وہ خود ایک دانہ ہے اور بارش نے اسے گھیر لیا ہے۔ اس کے گستاخ گیلے پن نے اسے آنے والی بارش کی بشارت دی۔

میہار جب صاف ستھرا لباس پہن کر، بال سنوار کر، آنکھوں میں سرمہ ڈال کر جب اس کے سامنے سے گزرتا تو آنکھیں نیچے کرلیا کرتی اور دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا کرتی، بس میہار کے لیے یہی سندیسہ کافی تھا۔ اس کے من کی کلی بھی کھل جایا کرتی تھی۔ ایک مرد صرف اس کے لیے سنگھار کرتا ہے۔ ان کی آنکھیں افق کی طرف مرکوز ہو جاتی تھیں۔ اپنی آگ میں خاک ہونے لگی، جیسے روکتی ویسے الاؤ بن جاتی۔ پھر ایک پوٹلی ملی، سرخی، پالش، کاجل اور مصری کی ڈلی۔ چٹکی بھر خاک، ملتانی مٹی کا ٹکڑا تو پاؤں جیسے انگارے پر پڑ گئے، بیٹھنا زہر بن گیا۔ ماں کو بتایا۔ عورت کو عورت سے راز فاش کرنا، خالق و مخلوق کا راز فاش ہونا اور سمجھنا۔ ماں نے دو چار چانٹے مار دیئے، طعنے دیئے اور آخر کار اس کی رازدان بن گئی۔ ماں بیٹی کا میل، کیا نہیں جانتی کیا نہیں سمجھتی۔ زندگی کی خشک سالی میں سوکھے پتے جھاڑے گھڑی پل کے لیے سرور کا جھونکا آ گیا اور وہ بھی کلہاڑی کے سائے میں، گھڑی پل کی معراج کے لیے سر کٹانا، قہقہے اور گھمسان، جیسے جو کچھ دیکھتی تھیں اس سے زیادہ لے رہی تھیں۔ میہار سے ملنے گئی تو ساری بہاریں جھولی میں لیے، زمین ڈولی بن چکی تھی، من کے پھول کھل اٹھے، سانسوں میں خوشبو جان بوجھ کر پرائی ہو چکی تھی۔ اس کی پوری کائنات پرائی ہو چکی تھی۔ اس کے پاس پہنچی تو پانی پانی ہوگئی۔ ہاتھ بڑھایا تو دور ہوگئی۔ واسطے دیئے، جھولی سامنے کی، لیکن چھونے بھی نہ دیا۔

واپس آکر ماں کی منت سماجت کرنے لگی، جان خلاص کروائیں۔ ماں کو زاری کی، دنیا کو پکارا، اچھے بھلوں کے دروازے کھٹکھٹائے، جس نے اس کے جسم کو نچوڑا تھا، اس سے بدن کیسے ملائے، مٹھو کو چھوڑ کر بچھو سے کیسے ڈسوائے، زخم تھے تو جہیز کے، نکاح پھندے سے، نکاح ٹوٹے یا گردن۔

> کسی کی لاج سب کا ناموس، کئی اجنبیوں کے سامنے لاش ننگی پڑی تھی۔ ٹیڑھے ہاتھ، زخمی پاؤں، حیران آنکھیں، حسرت و ہیبت سے پھٹی آنکھیں، نیک سیرت، رحمدل، سلیقہ شعار، گو نر دیا سوہنی۔ پیار کی راہ میں ایک اور قربانی، کٹنا قبول کیا مانگ کا وعدہ نہ ٹالا

جہاں پر زمین وزن پر سر کٹائے جاتے ہیں، وہیں لڑکیوں کا بیوپار بھی ہوتا ہے، بے دام کا دام ہو جاتا ہے۔ جہاں لڑکیاں نیلام ہوتی ہیں، سات قرآن، کوڑیوں کے دام، وہاں طلاق کون دے گا۔ بھدے پاؤں والا کہے گا کاٹ دیں نکاح نہیں چھوڑوں گا، بھل عمر کھا جاؤں۔ زمین وزن کسی نے چھوڑی ہے، دو دو ہاتھ اڑ رہا تھا۔ غیرت کی آڑ میں بے غیرت نظر، لاج پر نہیں لیکن لاج کی دام پر۔ ڈانٹ ڈپٹ، ظلم و ستم، قرآنی فرمان، دوسری طرف کچا دھاگا۔ بچی نراس، جاڑے کی جلائی ہوئی باڑہ، جس کی جڑوں میں پہلی بار رس بھری تھی۔ پختہ، اپنے حق پر قائم، ساتھی ہونے کا حق، پھول کھلانے کا حق۔ نازک دھاگے میں بندھے حق کو اتنی طاقتور کھینچ، لیکن دو ہزار روپوں کی وجہ سے وہ ایجاب اور قبول کا دھاگا اتنا مضبوط ہو چکا تھا۔

عورت ذات کچا دھاگا، لیکن جب اس کے نازک بدن کے تنتوں میں، عورت زاد کا آفاقی حق مانگنے کی برقی رو دوڑ گئی تو وہ بجلی بن گئی۔ چمک، چنگاریاں اور انگارے، جنہوں نے ان کے شوہر کی مردانگی کو لرزا دیا۔ وہ طلاق دینے کو تیار ہو گیا۔ اس کے لیے تو فقط دو الفاظ بولنے کی دیر تھی، لیکن جس کا عورت زاد کا حق چھینا جا رہا تھا، جس نے جان کی بازی لگائی تھی، جو ویسا ہی انسان تھی، جیسا اس کا شوہر، جو خود مظلوم تھی، وہ مانگنے والی کی طرح خیرات کی محتاج تھی۔ ان کے الفاظ اور ارادے بے وزن تھے۔ کیا توازن تھا؟ نکاح دو انسانوں کے بیچ میں ایک جیسی قبولیت تھی، ایک ایسے نحیف برتن کی مانند توڑ سکتا تھا اور دوسرے کے گلے میں اس کی مضبوط گرفت نقصان کس کا ہو رہا تھا۔ زمانے میں کس کی دام گر رہی تھی، جس کا جسمانی باغ لٹ رہا تھا، اس کے باوجود معاوضے کا مطالبہ بھی شوہر نے کیا اور پوری دنیا نے اس کے حق کی تائید کی۔ وہ حق اتنا مضبوط تھا جو اس کا بھائی اور ماں زنجیر بن گئے۔ باغ کا، گلستان کا، پھلدار درخت، عمر بھر کا ٹھیکا صرف دو ہزار روپیہ۔ بہن نے اپنے بھائی سے اداس آنکھوں سے صدقہ کا تقاضا کیا، آنکھوں سے برکھا برسنے لگی، لیکن دھارائیں زنجیر کو توڑ نہ سکیں۔ بھائی نے بھی فیصلہ دے دیا کہ کمینی کو چوٹی سے پکڑ کر شوہر کے حوالے کیا جائے۔ جسے دو ہزار عزیز لگے وہ لائق عزت ٹھہرا اور جس کے جسمانی جذبات کا نیلام ہوا، وہ قصوروار، کمذات۔ وہ آخری رات تھی، انت، ناامیدی نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ جب میہار نے اسے اشارہ کیا تو انہوں نے چار انگلیاں اُٹھا کر مانگ پر رکھ دیں۔ ان کا روح و جسم ایک قالب بن گیا۔ جسے نزدیک آنے نہیں دیا تھا ان سے الوداع کرنے کا انجام باندھ لیا۔ جسم و روح کی ارتی اٹھا کر پیار کی قربان گاہ کی طرف بڑھنے لگی تو بھائی نے دیکھ لیا۔ کلہاڑی اٹھا کر آنے لگا تو بیچاری سے جینے کی تمنا ابکائی کی طرح نکل گئی۔ دوپٹہ ڈال کر بھائی کے پاؤں میں لپٹ گئی۔ "میرے بھائی! مجھے نہ مار!" والدہ دوڑ کر قرآن شریف اٹھا لائی۔ "بیٹا اس کا واسطہ!" شوہر چیخ پڑا۔ "جیسی ہے ویسی ہے میری ہے، مجھے کالی بھی قبول ہے۔ خبردار میری امانت کو مت مارو۔"

"خاموش کمینا! کالی ہے۔"

"بھاگ! ارے معتبر تم نے کتنی کالی کی ہیں؟"

اتنے میں والدہ نے بھی قرآن شریف لا کر سامنے دکھایا، والدہ کو دھکا دے کر دور ہٹا دیا گیا، بہن کے شانوں پر پاؤں رکھ کر، اس کا سر کھینچ کر دور کر لیا۔ کلہاڑی اٹھ کر نیچے ہوئی۔ خوف سے اس نے ہاتھ سر پر رکھا، پہلے چار انگلیاں پھر گردن کٹ گئی۔ والدہ اور قرآن لہولہان۔ بھائی اور والدہ نے مل کر اس کا ازار بند کھولا۔ شلوار اتار دی۔ بھائی نے نعرہ لگایا۔

ہسپتال کا مردہ خانہ، کٹی ہوئی چوٹی، چقو کے زخم، خاک روب، ڈاکٹر، مکھیوں کی بھن بھن، ننگا سینہ، بہن، بیٹی، ساتھ قرآن۔

☆☆☆☆

غزل

آنکھ سے خواب لے گیا اور وہ اشک بھر گیا
عشق تھا یا خمار تھا وقت کے ساتھ اتر گیا

خوشبو کو تازگی ملی، رنگوں کو روشنی ملی
آئی بہار تو ہر ایک پھول سنور سنور گیا

شام ہوئی تو اس کی یاد روح میں جلوہ گر ہوئی
ہم ہوئے در بدر تو کیا کوئی تو اپنے گھر گیا

کِشتِ سراب کھِل گئی، منزلِ خواب مل گئی
میں نہ پہنچ سکا وہاں پر مرا ہم سفر گیا

تیری صدا کا جوش ہے، عرش اُدھر خموش ہے
دیکھ لے اے دریدہ دل تیرا بھی اب اثر گیا

کاسۂ زہر اس کے ہاتھ، شہر کا شہر اس کے ساتھ
جان عزیز تھی بہت ملنے اسے مگر گیا

دار پہ سر بلند ہوں، شاعرِ دل پسند ہوں
لے کے عروج پر مجھے ساتھ مرا ہنر گیا

شوقِ سوال کی قسم، رنگِ جمال کی قسم
تیرے جلال کی قسم میں وہ نہیں جو ڈر گیا

تیرا مرا ہے ربطِ خاص، بس میں نہیں مرے حواس
تُو نے کہا تو جی اٹھا، تو نے کہا تو مر گیا

علی یاسر

غزل

خواب سرا سے ہوتا ہوا تعبیر نگر تک آیا ہوں
ہیرے موتی اور جواہر دیکھو کیا کیا لایا ہوں

نشے سے معمور سخن جو مدہوشی کا باعث ہے
اس کی نشیلی قربت سے یہ رنگ چرا کر لایا ہوں

رہتا ہے تعمیر میں پنہاں اک تخریب کا پہلو بھی
وصل میں کوئل کی یہ کُوکُو سُن کے بہت گھبرایا ہوں

ابرِ بہاراں کوئی آ کر میری دھوپ کو ختم کرے
ورنہ میں اک جلتا صحرا بن پانی بن سایا ہوں

رنگ ہوائیں خوشبو لہریں آ کر مجھ کو چومتی ہیں
یثربِ دل میں دیکھوں دائم آپ کا میں ہمسایا ہوں

میرے ہاتھ کی فنکاری نے رنگ دیئے ہیں دنیا کو
"دُکھن" کی ایک مجسم صورت دنیا میں ٹھہرایا ہوں

ہوا سحابؔ اندھیرا ہر سُو، روشنی اس کے دم سے تھی
اب تو میں اک خالی گھر کا دیپک بجھا بجھایا ہوں

اسلم سحاب ہاشمی

غزل

کمالِ دستِ ہنر سے اُسے سہارا جائے
بَشر کو بحرِ حوادث میں جب اتارا جائے

وہ جس سے حسنِ تخیل میں ضَوفشانی ہے
کبھی نہ دُور مری آنکھ سے ستارا جائے

میں ناخُدا کی بد اندیشیوں سے ڈرتا ہوں
نہ وسوسوں میں کہیں ہاتھ سے کنارا جائے

کبھی تو وادیٔ دل میں بھی روشنی پھوٹے
کوئی تو منظرِ خوش آنکھ سے گزارا جائے

یہ بے نیازیٔ سُود و زیاں غنیمت ہے
کہیں تو اپنے مقدر سے بھی خسارا جائے

ریاضؔ مزرعِ ہستی کو پھر ضرورت ہے
جگر کے خون سے پھر سے اُسے سنوارا جائے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

اب ہجر کے خیال سے ڈرتے نہیں ہیں ہم
جاناں ترے بغیر بھی مرتے نہیں ہیں ہم

سکھلا دیا ہے ضبط محبت نے اس قدر
اب ٹوٹتے بھی ہیں تو بکھرتے نہیں ہیں ہم

جب سے ہمارے پاس سے رخصت ہوا ہے وہ
تب سے قسم خدا کی سنورتے نہیں ہیں ہم

تیرے میرے مزاج میں اتنا ہے فرق بس
وعدہ اگر کریں تو مکرتے نہیں ہیں ہم!

روبینہ شاد

غزل

وہ لوگ جو کھلی کتاب کی طرح نظر میں ہیں
یہ جانتے نہیں کہ احتیاط سے سفر میں ہیں

قیام کے لئے کوئی مقامِ دلبری نہیں
میں جانتا بھی ہوں کہ سارے مسئلے سفر میں ہیں

تلخیوں کے بعد کیسے کیسے رابطے ہوئے
یہ سوچ کر نبھا گئے کہ عمرِ مختصر میں ہیں

میں کیوں نہ ان کے راستے میں خاک بن کے بچھ رہوں
وہ مدتوں کے بعد پھر سے آج میرے گھر میں ہیں

اپنے گاؤں کی وہ سادہ زندگی کمال تھی
خیال آیا تاجؔ اب، تلاشِ در بدر میں ہیں

چودھری طاہر عبید تاج

غزل

تھکا ہارا ہوں مدت سے کہیں ستا نہیں پایا
خزانہ وقت کا کھویا ہے، ورنہ کیا نہیں پایا

سوائے ذاتِ اقدس کے کوئی پرساں نہیں دیکھا
کچھ ایسے زخم پوشیدہ ہیں جو دِکھلا نہیں پایا

مری بربادیِ دل کا تعلق تھا وفاؤں سے
کہ سب کچھ کر دیا لیکن انہیں جتلا نہیں پایا

خیالوں کی ہم آہنگی بہت دشوار جو ٹھہری
سمجھ پایا نہ خود کچھ اور کچھ سمجھا نہیں پایا

اجڑ جانے کا قصہ اُس نے جو پوچھا تو میں بولا
"یہ دل ظالم بہت ہے میں اسے بہلا نہیں پایا"

تجھے طاہرؔ سمجھ پانا بہت دشوار لگتا ہے
کہ تو موجِ رواں ساحل سے بھی ٹکرا نہیں پایا

چودھری طاہر عبید تاج

وقت

چلتے چلتے دفعتاً اِک چال چل جاتا ہے وقت
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں بدل جاتا ہے وقت

سچ ہی کہتے ہیں سدا وقت ایک سا رہتا نہیں
برف کی صورت بہرصورت پگھل جاتا ہے وقت

قُربتیں اور دُوریاں سب وقت کا اعجاز ہیں
صورتِ مہمان آج آتا ہے کل جاتا ہے وقت

وقت کو پابند کرنا کب کسی کے بس میں ہے
خود ہی رُک جاتا ہے تھم جاتا ہے ٹل جاتا ہے وقت

زندگی بھر وہ کفِ افسوس ملتا رہ گیا
جب کسی ناداں کے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے وقت

گاہے گاہے وقت پر بھی وقت آتا ہے کڑا
کوئی دیتا ہے سنبھالا اور سنبھل جاتا ہے وقت

وقت ہی کا دوسرا رُخ ہے مکافاتِ عمل
جب میاں تنویر دُوجا رُخ بدل جاتا ہے وقت

میاں تنویر قادری

دیکھتے ہیں

(احمد فراز کی روح سے معذرت کے ساتھ)

ہماری بات پہ اتنا ہے اعتبار اُنھیں
ہماری ذات کو وہ بیچ دھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے فون پر وہ گالیاں نہیں بکتے
سو آؤ اُن کو ذرا فون کر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے دُور کا چشمہ خراب ہے اُن کا
سو آؤ دُور سے ہی بات کر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے عشق ہے اُن کو فضول باتوں سے
اگر یہ سچ ہے تو بکواس کر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے شیخ جی بوتل بغل میں رکھتے ہیں
سو آؤ آج ہم اُن کو پلٹ کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے شیخ جی حُوروں کا خبط رکھتے ہیں
ذرا سی پی لیں تو جلوے اُدھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے قوم کی دولت ہے ہر وزارت میں
وہ بار بار الیکشن میں لڑ کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے وہ بھی کنوارے ہیں آج کل ساگر
سو آؤ اُن کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

ڈاکٹر غلام سرور ساگر (امریکہ)

منیر نیازی کی یاد میں

شب کی دیواروں سے پھوٹا لال لہو فوارہ
آدھی رات کو دروازے پر آ کر کوئی پکارا
او میرے ہم راز!
او میرے ہم راز!
تھوڑی دیر کے بعد آئی دروازہ کھلنے کی آواز
اور سرہانے آ کر میرے کسی نے کی سرگوشی
میرے جاگ اٹھنے سے پہلے جاگ اٹھی خاموشی
آنکھیں کھول کے دیکھوں تو اک سایہ سا لہرائے
سانس بھروں تو مرجھائے پھولوں کی خوشبو آئے
کون ہے وہ یہ کون بتائے

اختر رضا سلیمی

فیس بک

میں کل رات میں تنہائی سے بھاگ کر فیس بک پر گیا
تو کیا دیکھتا ہوں
وہاں ایک دوجے کی تنہائیاں بانٹنے والوں کی بھیڑ ہے
اور اس بھیڑ میں سب اکیلے ہیں، بالکل اکیلے
اکیلا پن ان کی تصاویر سے یوں جھلکتا تھا
جیسے وہاں لکھے لفظوں سے بے معنویت
مگر
قبل اس کے کہ بے معنویت کا یہ وائرس
فیس بک سے نکل کر مرے جسم میں پھیل جاتا
میں لاگ آف کر کے
وہاں سے اٹھا
اُٹھ کے دیوانِ غالب کی جانب بڑھا
اور طلسمِ معانی میں گم ہو گیا
مجھے سٹپٹایا ہوا دیکھ کر میرزا نوشہ گویا ہوئے:
لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

اختر رضا سلیمی

اختصارِ زیست

میں نے تجھے تلاش کیا
جزیروں کے دامن میں
پہاڑوں کی سنسان چوٹیوں پر
سردُرتوں کی ٹھنڈک میں
اے خدا!
سوچا تیری ذات کو
پُرہجوم رستوں پر
خامشی میں کھو کر
زندگی کے ہر رنگ کی اتھاہ گہرائی میں
اے خدا!
دیکھا تیری ذات کو
ناگہانی موتوں کے پردے میں
زندگی کی آس میں
خواہشوں کی پیاس میں
اے خدا!
پایا میں نے تجھ کو
اپنی شہ رگ سے بھی قریب
قابل ہوئی کہنا یہ زباں میری
تیری عظمتیں بیاں کرنے کے قابل
تیری نعمتیں شمار کرنے کے قابل
تُو اے خدا!
مجھے اپنے قریب موت نظر آئی

افشاں کرن

تجدیدِ عہد

دیکھو اک بار پھر
دسمبر لوٹ آیا ہے
کتابِ زیست میں ہم نے
روشنائی محبت سے
بے چینی روح میں ڈوبے
کچھ سسکتے، لرزتے لفظ
کچھ بے قرار سے جملے
لکھ ہی ڈالے ہیں
اب کی بار بھی
وفائے عہد کی رسم
برابر ہم نے نبھائی ہے
اور تنہا نبھائی ہے

افشاں کرن

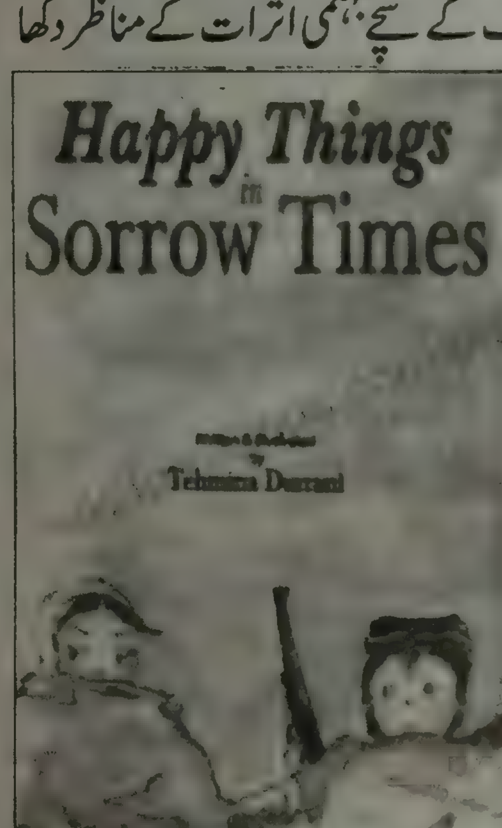
کتاب میلہ

بارود کی کہانی یا کہانی میں بارود از: تہمینہ درانی

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایسی بہت سی کہانیاں اور ناول لکھے گئے جن میں جنگ کی بدترین چڑیلی ہولناکیاں دکھائی گئیں۔ چونکہ دوسری جنگ عظیم کا "مظلوم ہیرو" امریکہ تھا لہذا زیادہ تر کہانیوں کے ولن



نازی تھے۔ لٹریچر نے اپنا سفر جاری رکھا اور ویت نام کی جنگ کے بعد بھی ایسا بہت کچھ لکھا گیا مگر اِس مرتبہ پرانا "مظلوم ہیرو" اب "بھوت ولن" تھا۔ امریکیوں کے ویت نامیوں پر برسات کی طرح برسائے جانے والے قہر کی داستانیں دنیائے ادب میں اپنا ایک نمایاں مقام بنا گئیں۔ اس کے بعد جنگ رکی نہیں بلکہ اپنی جگہ اور شکل تبدیل کر گئی۔ لٹریچر بھی نہیں رکا مگر کچھ بے خبر اور مفادی ہو گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ آنے والی جنگیں یورپ اور غیر مسلمان ملکوں کی بجائے مسلمان ملکوں میں لڑی جاتی تھیں۔ جنگ کو نئی شکل دے کر کچھ ایسی حکمت عملی تیار کی گئی تھی کہ بڑی طاقتوں کا کاروبار بھی چلے اور پاؤں بھی زخمی نہ ہوں۔ یعنی مسلمان ممالک میں میدان جنگ سجانے کے لئے زیادہ تر افرادی قوت انہی مسلمان ملکوں سے لی جائے جو آپس میں ایک دوسرے کو دشمن قرار دے دیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے بچے کھیل میں دو ٹیموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں مگر یہ کھیل بچوں کا نہیں بلکہ بڑی طاقتوں کا خونی کھیل تھا جس میں وہ اپنا خوب اسلحہ بیچیں اور مفادات اٹھائیں لیکن دوسری جنگ عظیم اور ویت نام کی طرح زخمی یا مرنے والوں میں شامل نہ ہوں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے ہر شعبے پر بڑی طاقتوں کا قبضہ قائم کر دیا گیا۔ لٹریچر اور اس کے موضوعات پر بھی انہی طاقتوں کے پنجے گاڑ دیئے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ تیس چالیس برسوں میں مسلمان ممالک میں لڑی جانے والی جنگوں کی تباہ کاریوں کے بارے میں دوسری جنگ عظیم اور ویت نام کی طرح کا کوئی خاص انٹرنیشنل لٹریچر نہیں لکھا گیا۔ انٹرنیشنل لٹریچر کی بے خبری کے اس دور میں بدترین چڑیلی اثرات رکھنے والی جنگ افغانستان میں لڑی گئی۔ یہ جنگ شاید اپنی نوعیت کی اب تک کی دنیا کی واحد جنگ ہے جس میں 4 دہائیوں کے دوران دوست اور دشمن اپنی اپنی جگہ بدلتے رہے ہیں۔ کبھی جو پہلے دوست ہوتا تھا وہ بعد میں دشمن بن جاتا اور پہلے والا دشمن دوست کہلاتا۔ اس جنگ کو نئی تکنیک اور حکمت عملی کے ذریعے اتنا کنفیوز بنا دیا گیا کہ نہ کوئی ہیرو بن سکے اور نہ کوئی مظلوم۔ کسی کو کچھ معلوم نہ ہو کہ اُن کا اپنا کون ہے اور پرایا کون۔ جیسے کسی گھر میں ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے رہتے ہوں مگر وہاں اس حد تک بدبختی آ جائے کہ باری باری سب ایک دوسرے کے جانی دشمن بنتے رہیں۔ افغانستان میں جنگ مفاد پرستی اور کاروبار کے لئے تھی جس کی "اونرشپ" پہلے دو بڑی طاقتوں اور اب مغرب کے پاس ہے مگر جنگ کی "خونی شپ" صرف افغان لوگوں کی قسمت میں لکھ دی گئی۔ اس پر بھیانک ظلم کہ افغانستان کے حقیقی خونی مناظر کو دنیا کے لٹریچر کی آنکھ سے بھی اوجھل کر دیا گیا۔ اگر کچھ لکھا گیا یا فلمیں بنائی گئیں تو وہ انہی طاقتوں کی مفاد پرستی اور کاروبار کو بڑھاوا دینے کے لئے بنائی گئیں۔ لہذا کسی ایسی مضبوط تحریر کی ضرورت تھی جو کسی حد تک دنیا کو افغانستان کی جنگ کے سچے جہنمی اثرات کے مناظر دکھا سکے۔



اس تحریر کے لئے جہاں ایک معروف نام کی ضرورت تھی وہیں تحریر کا اچھا ہونا بھی ضروری تھا۔ جب تہمینہ درانی کی Happy Things in Sorrow Times کتاب سامنے آئی تو وہ مندرجہ بالا معیار پر پوری اتری کیونکہ تہمینہ درانی اس سے قبل "My Feudal Lord" سے اتنی شہرت حاصل کر چکی تھیں کہ بین الاقوامی قارئین اور تجزیہ نگار انہیں اچھی طرح پہچاننے لگے تھے۔ تہمینہ درانی کی یہ تازہ کتاب ایک ناول کے طور پر جانی جا رہی ہے۔ اس میں تہمینہ درانی کے وہ حقیقی مشاہدات اور تجربات بھی شامل ہیں جو انہوں نے افغانستان اور پاکستان کے مہاجر کیمپوں میں براہ راست حاصل کئے۔ بنیادی طور پر اس کہانی کا پلاٹ اس معصوم لڑکی کے گرد گھومتا ہے جس کے ماں باپ اور بہن بھائی سوویت یونین کی جنگ میں مارے گئے۔ اِس کے بعد اُس لڑکی کی زندگی زمینی جہنم کی بدترین درجے کی زندگی سے بدترین ہوتی گئی مگر وہ اپنی امیدوں اور یادوں کے سہارے جنت کی ٹھنڈی ہوا لے کر راستے کی اگلی آگ میں جلنے لگتی۔ ناول ریڈر کو جہاں لرزا دیتا ہے وہیں رلا بھی سکتا ہے لیکن مفادی اور کاروباری اونرز اِن تحریروں سے کب کانپیں گے؟ تہمینہ درانی کی مذکورہ کتاب کے Audience شاید پاکستان اور افغانستان کے لوگ نہیں ہیں بلکہ اس کتاب کا اصل ٹارگٹ یورپ اور امریکہ ہے کیونکہ پہلی بات یہ کہ اس ناول کو انگریزی میں تحریر کیا گیا جو پاکستان اور افغانستان جیسے ملکوں میں کم سمجھی جاتی ہے اور ان کم سمجھنے والوں میں بھی بہت کم لوگ کسی انگریزی تحریر سے مکمل طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ تہمینہ درانی نے مغرب کو اپنی تحریر کی طرف متوجہ کرنے کے لئے شاید یہ کوشش دانستہ کی ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ گزشتہ چار دہائیوں سے جاری اس جنگ کی ہولناکیوں سے افغانستان خاص طور پر اور پاکستان کسی حد تک اتنا متاثر ہو چکا ہے کہ ناول میں بیان کی گئی Miseries سے یہاں کے عام لوگ شاید زیادہ متاثر نہ ہوں کیونکہ وہ وہی تو ہیں جو خودکش حملوں اور ڈرون حملوں میں براہ راست زندہ ہیں۔ بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ تہمینہ درانی کا یہ ناول بچوں کے ناول Alice's Adventures in Wonderland سے ملتا جلتا ایک ناول ہے جس میں مرکزی کردار ایک لڑکی کا ہے لیکن یہ تبصرہ درست نہیں ہے کیونکہ اُس ناول میں لڑکی خرگوش کے گھر میں داخل ہو کر کسی خیالی دنیا میں چلی جاتی ہے مگر اُس کہانی میں جنگ کی ہولناکیوں کا کہیں ذکر نہیں جبکہ تہمینہ درانی کے ناول میں موجود مرکزی کردار والی لڑکی "بسرابعہ" اُس طرح کی خیالی دنیا میں جانے کی بجائے جنگ کی ہولناکیوں کو اپنے اوپر برداشت کر کے اور اُن میں زندہ رہ کر اپنی یادوں کو مستقبل سے جوڑ کر جوان ہوتا دیکھنا چاہتی ہے۔ البتہ تہمینہ درانی کے ناول Happy Things in Sorrow Times کے عنوان کے الفاظ ویت نامی جنگ پر لکھے جانے والے دو ناولوں The Sorrow of War اور The Things They Carried سے کچھ ملتے ہیں جبکہ اِن میں سے The Sorrow of War کی کہانی صرف اس حد تک تہمینہ درانی کے ناول سے ملتی ہے کہ ایک ویت نامی سپاہی ویت نامی جنگ کے بعد مرے ہوئے انسانوں اور جانوروں کی ہڈیوں اور گوشت ٹھکانے لگانے کے مشن پر جاتا ہے اور ناول کے اندر ہی ایک ناول کی صورت میں جنگ کی ہولناکیاں تحریر کرتا ہے۔ جب ناول کے اندر کا ناول مکمل ہونے لگتا ہے تو وہ سپاہی اسے جلانے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کی دوست "گونگی لڑکی" اس ناول کو بچا لیتی ہے۔ اِن سب سے بڑھ کر تہمینہ درانی کا ناول دوسری جنگ عظیم کے حوالے سے سامنے آنے والے Anne Frank کے شہرہ آفاق اور انعام یافتہ ناول The Diary of a Young Girl کے زیادہ قریب ہے جو کہ ایک بچی آپ بیتی ہے۔ اس ناول میں لکھا گیا ہے کہ ایک کم سن لڑکی نازی سپاہیوں کی بربریت سے بچنے کے لئے مختلف جگہوں پر اپنے اہل خانہ کے ساتھ چھپتی پھرتی ہے مگر اس لڑکی اور اس کے اہل خانہ کو پناہ دینے والے

ہی مخبری کر دیتے ہیں۔اس طرح وہ لڑکی اور اس کے اہل خانہ نازی ٹارچر کیمپوں میں پہنچا دیئے جاتے ہیں جہاں انسانیت سوز واقعات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔تقریباً 2 سال بعد جب جنگ کے اختتام پر ان قیدیوں کی رہائی کا وقت آتا ہے تو ایک اور ٹریجڈی جنم لیتی ہے۔وہ یہ کہ رہائی سے صرف 2 ہفتے قبل وہ لڑکی تشدد اور بیماریوں کے باعث مر جاتی ہے۔بعد ازاں اس کے ہاتھ کی لکھی یہی ڈائری شائع ہوتی ہے اور انٹرنیشنل لٹریچر میں اپنا مقام بناتی ہے۔تہمینہ درانی نے اپنے ناول میں جنگ کی تباہ کاریوں کو اجاگر کرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے بنائی گئی کچھ پینٹنگز کو بھی شامل کیا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا یہ آئیڈیا بھی ویت نام کی جنگ کے حوالے سے شائع ہونے والے تصویری ناول The Girl in the Picture سے ملتا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک کم سن لڑکی کس طرح نیپام بم سے ذہنی اور جسمانی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ان تصویروں کی اشاعت کے بعد یورپ اور امریکہ میں بہت تہلکہ مچا جس نے ویت نام کی جنگ کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے میں بہت مدد کی۔دیکھنا یہ ہے کہ تہمینہ درانی کے ناول میں دکھائی گئی پینٹنگز کس حد تک یورپ، امریکہ اور "افغان جنگ کے اونرز" کو متاثر کرتی ہیں۔تہمینہ درانی کے اس جدید ناول میں جدت کے اعتبار سے ایک کمی ہے۔وہ یہ کہ مغرب میں شائع ہونے والی کتابوں کے ساتھ اُن کی سافٹ کاپی DVD کی صورت میں موجود ہوتی ہے جس کی اپنی بہت اہمیت ہے۔پاکستان میں پبلشرز کے معاشی حالات کی وجہ سے یہ رجحان ابھی ترقی نہیں کر سکا مگر تہمینہ درانی جیسی Resourceful لکھاری کے لئے یہ بات مشکل نہیں تھی۔تاہم قاری کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ تہمینہ درانی کا یہ ناول بارود کی کہانی ہے یا کہانی میں بارود ہے۔

مبصر: سید سردار احمد پیرزادہ

(بشکریہ: روزنامہ نوائے وقت)

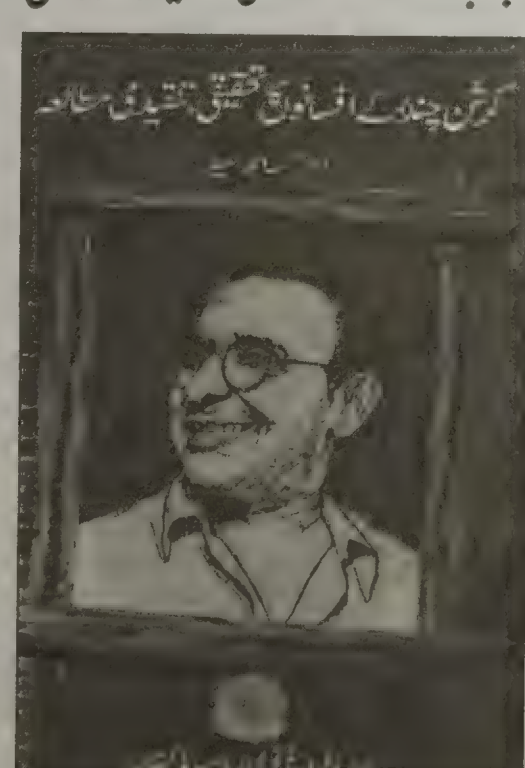
کرشن چندر کے افسانوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

کرشن چندر کے افسانوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ ڈاکٹر آنسہ احمد سعید اعوان کے پی ایچ۔ڈی (اردو) کے مقالے کا کتابی روپ ہے۔ڈاکٹر صاحبہ کو ۲۰۰۰ء میں اس مقالے پر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی سندِ فضیلت تفویض ہوئی۔انھوں نے اس مقالے میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری کو چھے ابواب میں منقسم کر کے ان کے فکری اور فنی امتیازات کو نہایت ہی احسن انداز میں قلم بند کیا۔کرشن چندر اپنے عہد کے ممتاز اور بعض حوالوں سے بالکل منفرد افسانہ نگار تھے۔انھوں نے ناول بھی لکھے اور ڈرامے بھی۔رپورتاژ کی صنف بھی ان کے حسنِ تخیل کے چمن سے پھول چنتی رہی اور بچوں کا ادب بھی ان کے خیالِ حسن کی خوشبو سے معطر رہا۔کئی دیگر اصنافِ ادب بھی ان کے احساسِ خیال کی رعنائی اور اظہارِ نگارش کی زیبائی سے برگ و بار لاتی رہیں۔ان کا تخلیقی وفورِ اظہار کے نئے نئے رنگوں میں ڈھل کر اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہا---لیکن ان تمام رنگوں میں افسانے کا رنگ نمایاں بھی رہا اور چوکھا بھی۔موضوعات کی رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ ان کا افسانہ اپنے تکنیکی تنوع اور اسلوبِ اظہار کی خوش رنگی کا آئینہ دار بن گیا اور وہ اس کے باعث اپنے ہم عصروں میں بہت سر بلند ہوئے۔ان کا افسانہ، ان کے تخلیقی وفور اور حسنِ اظہار کا ترجمان ٹھہرا۔وہ بطور افسانہ نگار اپنی معاصر ادبی روایت میں ایک ممتاز اور توانا آواز بن کر ابھرے اور افسانوی ادب کی فضا پر چھا گئے۔آج بھی ان کی آواز اپنی انفرادیت کا جادو جگا رہی ہے۔ان کے اس افسانوی سرمائے میں ان کا فکری اور فنی نظام مختلف اور متنوع رنگوں میں منکشف ہوا۔وہ بہت زود نویس افسانہ نگار تھے، لیکن ان کی یہ زود نویسی ان کے تخلیقی پر اثر انداز نہیں ہوئی۔پیشِ نظر تحقیقی کام میں ڈاکٹر آنسہ سعید اعوان نے کرشن چندر کی افسانوی کائنات کے خوش کن مناظر کو بڑی دقتِ نظر اور بصیرت افروزی سے آشکار کیا۔انھوں نے چھے ابواب میں اپنے مطالعاتی افادات کو اس انداز سے منقسم کیا کہ ان کے افسانے کے مختلف رنگ نمایاں ہو گئے۔



ڈاکٹر آنسہ احمد سعید

مقالے کا پہلا باب اردو افسانے کی روایت اور اس کے فن کے مختلف مراحل کا ترجمان ہے۔اس میں ڈاکٹر صاحبہ نے افسانے کے آغاز سے لے کر کرشن چندر تک اس صنفِ ادب کے ارتقائی سفر کا انحصار اور جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا۔اس فن کدے کے فنی، ہیئتی اور تکنیکی خدوخال کو نمایاں کیا۔



دوسرے باب میں کرشن چندر کے افسانوی سرمائے کو زمانی ترتیب سے پیش کیا گیا۔اس پیشکش میں ان کی افسانہ نگاری کا ارتقائی سفر مختلف ادوار میں تقسیم ہو کر ان کے فکری اور فنی ارتقا کو سمجھنے اور ان کے مقام اور مرتبے کی تعیین کا باعث ہوا۔

تیسرے باب میں کرشن چندر کے افسانوں کے مختلف اور متنوع موضوعات کو سلیقے اور قرینے سے پیش کیا گیا۔ان موضوعات میں کرشن چندر کی انفرادیت کے رنگ بھی نمایاں ہوئے اور ان کی افسانوی کائنات کی وسعت، گہرائی اور گیرائی کا بھی اندازہ ہوا۔ان کے موضوعات کا گنجینۂ معانی کی طلسماتی اپیل کے تناظر میں ڈھل کر نئی تعبیر کا آئینہ دار بن گیا۔

چوتھے باب میں کرشن کے افسانوی کرداروں پر بحث کی گئی۔ڈاکٹر صاحبہ نے کرشن چندر کے افسانوں کے اہم اور نمایاں کرداروں کا مطالعہ کیا اور افسانوں کے مجموعی تناظر میں ان کی فکری معنویت کو اجاگر کیا۔

پانچویں باب میں کرشن چندر کے افسانوں کا فنی مطالعہ کیا گیا۔اس باب میں تکنیکی اور ہیئتی امور بھی زیرِ بحث آئے۔زبان و بیان کا بھی جائزہ لیا گیا اور اسلوبِ اظہار کے مختلف رنگوں کا بھی تجزیہ کیا گیا۔زبان، بیان اور تکنیک کے جملہ مباحث اس باب کی زینت بنے۔ڈاکٹر صاحبہ نے نہایت ہی خوش اسلوبی سے ان کی تعبیر اور تفہیم کا فریضہ انجام دیا۔

آخری باب میں کرشن چندر کے افسانوں کے فکری پہلو تلاش کیے گئے اور انھیں توازن اور اعتدال کے ساتھ نمایاں کیا گیا۔اسی باب میں کرشن چندر کے مقام اور مرتبے سے بھی بحث کی گئی۔معاصر افسانہ نگاروں کے جھرمٹ میں ان کی انفرادیت کے رنگوں کو اجاگر کیا گیا۔

پاکستان میں کرشن چندر کے فنی اور فکری نظام کا اتنا بھرپور اور مربوط مطالعہ نہیں کیا گیا۔ڈاکٹر صاحبہ نے ایم فل کی سطح پر ان کے ناولوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور پی ایچ۔ڈی کے لیے ان کی افسانوی کائنات ان کا موضوعِ سخن رہی۔انھوں نے نہایت محنت اور توجہ سے ان کے افسانوی ادب کا جائزہ لیا۔پیشِ نظر کام ان کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کا ترجمان ہے۔کرشن چندر کے حوالے سے تمام اہم منابع اور مصادر ان کے پیشِ نظر رہے ہیں۔انھوں نے اس مواد سے اخذ و استفادہ کیا اور کرشن چندر کے فکر و فن کا عمدہ تجزیہ کیا۔ان کی زبان اور اسلوب سادہ، عام فہم اور تحقیقی اصولوں کے مطابق ہے۔انھیں اپنے مافی الضمیر کی ترجمانی میں کہیں بھی مشکل کا سامنا نہیں رہا۔پورے مقالے میں کہیں بھی الجھاؤ اور گنجلک نہیں۔افسانوی ادب کے حوالے سے لکھے گئے مقالوں میں یہ مقالہ کئی حوالوں سے منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔مجموعی تناظر میں یہ تحقیقی کام نئے محققین کے لیے سمت نما ہے۔افسانے کی تنقید کے عام قارئین بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔۳۱۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۴۵۰ روپے ہے۔اس گرانی کے دور میں یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں۔کتاب ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد نے شائع کی ہے اور ان کے کتاب گھر میں دستیاب ہے۔

مبصر: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

دائرے کا سفر — از: آنسہ ڈاکٹر احمد سعید

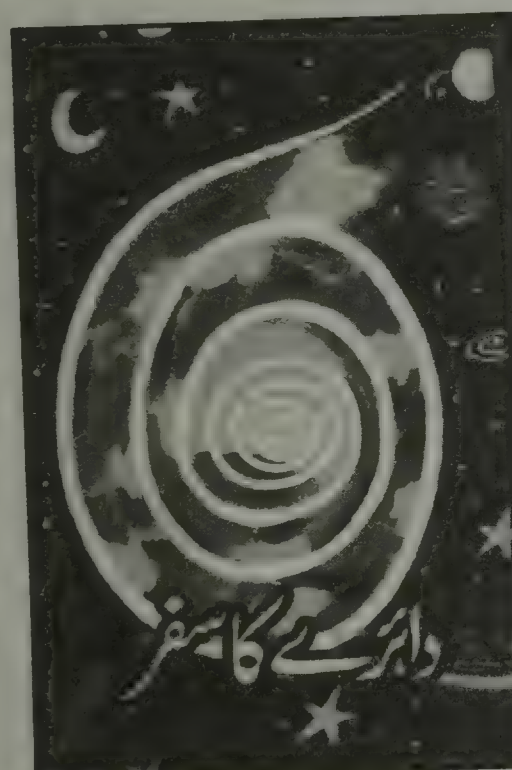
ڈاکٹر آنسہ احمد سعید اعوان اس اعتبار سے خوش ب ہیں کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے پہلی پی۔ڈی کا زاز اُن کے حصے آیا۔ یہ بھی اُن کے لیے باعث افتخار ہے کہ انھوں نے ایم فل اور ڈاکٹریٹ کی دونوں ڈگریاں اسی یونیورسٹی سے لیں۔ ان دونوں ڈگریوں میں ان کا موضوع کرشن چندر کی افسانہ نویسی اور ناول نگاری ہے۔

ہندوستان کے کسی ہندو ادیب کو تقسیم ہند کے بعد اپنا موضوع تخلیق بنا کر ایک مسلمان خاتون نے بڑی بلند ظرفی، وسیع النظری اور بے تعصبی کا ثبوت دیا ہے اور یہی اُن کا امتیاز ہے۔ انھوں نے اس موضوع کا انتخاب اس وقت کیا جب یہ مصنف پاکستان میں لوگوں کے ذہن سے اُتر چکا تھا اور بوجوہ پاکستان کے علمی حلقوں میں بڑی حد تک نامعتبر ہو چکا تھا۔ ان حلقوں سے اس موضوع کو منظور کرانا بھی آسان نہیں رہا تھا۔ موضوع کی منظوری کا مرحلہ شعبہ اردو کی کوششوں سے خدا خدا کر کے طے ہوا۔ پھر اس موضوع کے بارے میں مواد بھی پاکستان میں دستیاب نہیں تھا۔ ہندوستان سے مواد کا حصول بھی جوئے شیر لانے کے برابر تھا لیکن آنسہ نے چوں توں کر کے یہ مرحلے بھی کامیابی سے طے کر لیے اور انھوں نے یہ پل صراط بھی عبور کر لیا۔ اس کے لیے انھیں بے پناہ وسائل اور وقت صرف کرنا پڑا اور بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

کرشن چندر ایک بہت ہی مقبول قلمکار تھے۔ ناشرین نے اُن کی اس مقبولیت سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ کرشن چندر کے نام پر بہت سی جعلی کتابیں چھاپ کر اپنی تجوریاں بھر لیں اور تحقیق کرنے والوں کی مشکلات میں اضافہ کیا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے بڑی دقت نظر سے کام لے کر اور مختلف ماخذ کو پیش نظر رکھ کر کرشن چندر کے اصلی اور جعلی ادب پاروں کو الگ کیا۔ اُن کی کاوش سے کرشن چندر کے افسانوں اور ناولوں کی اصل تعداد کا تعین کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحبہ نے بڑی ژرف نگاہی اور دقتِ نظر کا استعمال کیا۔ اپنے آپ کو ایک بلند نظر محقق کے طور پر پیش کیا۔ چھان پھٹک کا یہ کام بڑی محنت سے انجام دیا۔ اپنی جگہ یہ بھی بہت بڑا کام بلکہ کارنامہ ہے۔

کرشن چندر کی ادبی زندگی کا عرصہ کم و بیش چالیس سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ ان کے سارے تخلیقی کام کو پرکھنا مشکل کام تھا لیکن انھوں نے اس کام کو بڑے سلیقے سے انجام دیا۔ یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ اچھا محقق اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تخلیق اور تحقیق ادب دو الگ الگ پیشے ہیں اور ان کے لیے مزاج بھی مختلف چاہئیں، تخلیق اور تحقیق کا یہ اختلاف اپنی جگہ بڑی حد تک درست بھی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ نے جہاں کرشن چندر کی افسانہ نگاری اور ناول نویسی کی چھان پھٹک میں اپنی تحقیقی کاوشوں کا ثبوت دیا ہے۔ وہاں انھوں نے ''دائرے کا سفر'' کے نام سے شعری مجموعہ مرتب اور تصنیف کر کے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بڑا ثبوت دیا ہے۔

اردو کی ادبی تاریخ کے ہی اوسط ضخامت کے مختصر مجموعے تعریف کے زیادہ مستحق قرار پائے ہیں۔ یہ مجموعہ بھی ہر لحاظ سے اسی زمرے میں آتا ہے۔ اختصار اس کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ یہ مجموعہ ۷۱ غزلوں ۲۵ نظموں اور ۱۶ قطعات پر مشتمل ہے۔ مجموعے کا آغاز حمدیہ اور نعتیہ قطعات سے ہوا۔ اس کا انتساب ماں کے نام کیا گیا ہے۔ جو انسانی رشتوں میں سب سے معتبر اور سب سے مقدس رشتہ ہے۔ اس مجموعے میں ماں کے عنوان سے دو بڑی اثر انگیز نظمیں شامل ہیں۔



پاکستان میں آنے والے اندوہناک زلزلے پر بھی ایک نظم اس مجموعہ میں نظر آتی ہے۔ اس نظم میں اس المیے پر ماں کے احساسات کی بڑی مؤثر تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس نظم کے آخری حصے کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

آفت زدہ انسانوں کی
بین کرتی ماؤں کی
ماں کی گود کی لوری
چلچلاتی پھرتی ہے
سسکیاں بھرتی ہے

دائرے کے سفر کی شاعرہ نے ماں کو روشن ستارہ کہا ہے۔ ماں کے لیے یہ استعارہ کتنا معنی خیز ہے۔ اس خوبصورت نظم کا آخری بند ملاحظہ فرمائیں:

وہ نور کا ہالہ.................معصوم سا چہرہ
ستارا بن کے آسمانوں کی بلندی پر مسکراتا ہے
جسے میں ہر رات دیکھتی ہوں اور یہ کہتی ہوں
یہ روشن ستارا ہی تو
میری ماں کا چہرہ ہے
میری ماں کا چہرہ ہے

ماں کی محبت اور اس کی عقیدت ہر مصرعے سے جھلکتی ہے۔

آنسہ کی غزلوں کا موضوع تو عشق و محبت ہے ہی لیکن ان غزلوں میں کامرانیاں کم اور حسرت و حرمان زیادہ ہے اور ویسے بھی محبت کی کامرانیوں کا ذکر زیادہ لطف نہیں دیتا۔ حسرت و حرمان کا تذکرہ زیادہ جاندار ہوتا ہے۔ غزلوں میں اشعار کی تعداد زیادہ نہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی غزل چھ یا سات شعروں پر مشتمل ہے اور زیادہ سے زیادہ اشعار دس ہیں۔ اشعار کی تعداد سے غزلوں میں توازن کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں اچھے اشعار کی کمی نہیں، چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

زہر میں ڈوبی ہوئی تھی شامِ غم کی ہر گھڑی
آنسوؤں میں یاد کا جلتا دیا اچھا لگا

چپ رہا بیٹھا رہا کوئی گِلہ شکوہ نہ تھا
دور تک مُڑ مُڑ کے اس کا دیکھنا اچھا لگا

کوئی بھی سایہ نہیں، گرمی میں ٹھنڈی چھاؤں کا
تپ گئی ساری زمین جھلسا ہوا ہے آسمان

کارواں کا ساتھ تو اپنے مقدر میں نہ تھا
دم بخود ہو کر غبار کاروان دکھا گئے

مدت ہوئی ہے ترکِ تعلق کیے ہوئے
پھر کیوں کسی کو یاد کیے جا رہا ہوں

اس مجموعے میں ۲۵ نظمیں بھی موجود ہیں۔ نظموں کے عنوان اور طرزِ بیان میں جدت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کتاب میں قابل ذکر نظموں میں دو تو ماں کے موضوع پر ہیں۔ دونوں نظمیں ان کی محبت اور اس سے عقیدت کی ترجمان ہیں۔ اس کا پہلا بند ماں کے ایثار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

تو نے اک بار کہا تھا
جیون کے اندھیرے میں
تم چلتے چلتے تھک جاؤ تو
تم میرے پاس چلے آنا
میں اپنی ممتا کا جوبن
سب تم پر لُٹا دوں گی

ان نظموں میں دو نظمیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ایک تو داستان پہاڑوں کی ہے۔ اس اندوہناک زلزلے سے ہونے والی ہلاکتوں کو شاعرہ نے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور قلم کی توانائیوں سے اس کی دلدوز کیفیتوں کو بڑے مؤثر طریقے سے بیان کیا ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

ٹوٹے ہوئے مکانوں کی
بکھرے ہوئے مکینوں کی
بین کرتی ماؤں کی
غم میں ڈوبی بہنوں کی
ماتم بھری فضاؤں میں
دل دہل جاتا ہے
جب کوئی سناتا ہے
داستاں پہاڑوں کی

دوسری قابل ذکر نظم کا عنوان ''وہ آنسو جو آنکھ

سے ٹپکا اور نوحہ بن گیا''۔ یہ کسی عظیم شخصیت کی موت کا مرثیہ ہے۔ اس دردناک رات میں اس موت کے غم میں پوری کائنات غمزدہ ہے۔ اس میں کسی کے سولی چڑھنے کا ذکر ہے۔ اس قتل کو شاعرہ نے خونِ ناحق کہا ہے۔ نظم پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ کس کے بارے میں ہے۔ اس نظم کے آخری بند کے کچھ مصرعے دیکھیں:

دیکھو تو سہی، پوچھو تو سہی
یہ کون بھلا سولی چڑھا
اک سوگ کا عالم طاری ہے
جس رات میں خونِ ناحق ہوا
وہ رات جو ہم پر بھاری ہے
اس رات کا زخم بھی کاری ہے

آنسہ چھوٹے چھوٹے مؤثر مصرعوں سے اپنی نظموں کا تاروپود بنتی ہیں اور ایک ایک مصرعہ تیر کی طرح چبھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مصرعے بلا کے مصرعے ہیں۔ جتنے سادہ ہیں اتنے ہی پُراثر ہیں۔ یہ ابلاغ کا معجزہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دونوں نظمیں دردناک ہیں اور تاثر سے معمور ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ اس مجموعے میں سولہ قطعات بھی شامل ہیں۔ اگرچہ ہر قطعہ چار مصرعوں کا ہے لیکن شاعرہ نے انھیں رباعی نہیں کہا۔ کیونکہ قطع رباعی کے وزن میں نہیں ہے۔ جو اس وزن کی فنی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاعرہ نے انھیں قطعہ ہی کہا ہے۔ قطعہ کہنا فنی لحاظ سے قدرے مشکل ہے۔ ان قطعات میں شاعرہ نے اپنی ذات کے بارے میں زیادہ کہا ہے۔ ان قطعات میں بھی افکار کی تازگی نظر آتی ہے۔ ان میں آپ بیتی کا رنگ زیادہ ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ کے شعری مجموعے کا نام بے حد معنی خیز ہے۔ دائرے کے سفر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس سفر کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ مسافر کولہو کے بیل کی طرح گھومتا رہتا ہے اور یہ سفر ختم نہیں ہوتا۔ اس نام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سفر کی یہ تعبیر ہمارے حسبِ حال بھی ہے۔ کیونکہ ہمارا سفر بھی دائرے کا سفر ہی محسوس ہوتا ہے۔ نامور شاعر منیر نیازی نے بھی اس بات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ ہمارے ملک پر آسیب کا سایہ ہے کیونکہ یہاں حرکت تیز تر ہے لیکن سفر آہستہ ہے۔ اس مجموعہ میں اصناف کا عمدہ تنوع ملتا ہے۔ اس میں غزلیں، نظمیں اور قطعات ہیں لیکن غزل کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں پے در پے سات غزلیں ہیں۔ دائرے کے سفر میں بیشتر غزلیں حسرت و حرمان کی ترجمان ہیں۔ ان کا لہجہ دھیما اسلوب سادہ اور کہیں آراستہ و پیراستہ ہے۔ نظموں کی تکرار سے ایک خاص آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے بعض مصرعے دل کو چھو لیتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیں:

گھٹتی گھٹتی ہیں ساعتیں، بجھی بجھی سی شام ہے
فریب ہی فریب ہے حیات جس کا نام ہے

ساری نظمیں سادگی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں کوئی الجھاؤ نظر نہیں آتا۔ نظموں میں طوالت کا احساس کم ہوتا ہے، منظومات میں جذبات کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے اور یہ سب اثرانگیز ہیں۔ مثلاً وہ آنسو جو آنکھ سے ٹپکا اور نوحہ بن گیا، کسی بڑی شخصیت کا مرثیہ ہے۔ یہ نظم بڑی دردانگیز ہے۔ اسی طرح داستان پہاڑوں کی میں بھی اس اندوہناک زلزلے کو موضوع بنایا گیا۔ یہ نظم بھی بڑی المناک ہے۔ کرشن چندر کے ناولوں اور افسانوں پر ڈاکٹر صاحبہ نے بڑی محنت اور ذہانت سے لکھا ہے اوان کا شعری مجموعہ ''دائرے کا سفر'' اپنے عنوان کی معنویت اور اشعار کی دل آویزی کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

مبصر: ڈاکٹر پروفیسر محمد صدیق خان شبلی

ناشر: احسن پبلی کیشنز، ۶۰۰۔بی۔ پیپلز کالونی نمبر۱، فیصل آباد
قیمت: ۲۵۰ روپے۔ فون: ۰۴۱-۲۶۱۳۴۴۹

''خواب گاہ'' از: موپساں، ترجمہ ریاض قدیر

''خواب گاہ'' موپساں کی منتخب بیس کہانیوں پر مشتمل کتاب ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ ''ریاض قدیر'' نے کیا ہے، انھوں نے موپساں کے افسانوں کا گہرا مطالعہ کر کے اسے اردو کے رنگ میں ڈھالا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس حوالے سے لکھتے ہیں:



مبصر: صبا بتول رندھاوا

''پروفیسر ریاض قدیر نے موپساں کو پہچانا اور اُسے اپنے تراجم کے ذریعے اردو والوں سے اس طرح متعارف کرایا کہ اردو میں جہاں کہیں اور جب بھی موپساں کے افسانوں کا ذکر آئے گا، پروفیسر ریاض قدیر کا ذکر ضرور آئے گا''۔ ص:۱۱

ریاض قدیر کے تراجم اس لیے اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے اردو زبان میں بھی موپساں کی اندازِ تحریر کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے تراجم میں کوئی کمی یا جھول دکھائی نہیں دیتا۔

''ریاض قدیر کا کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تراجم میں موپساں کے افسانے کی خصوصیات کو ہر جگہ برقرار رکھا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ریاض قدیر کے تراجم اپنی اثرپذیری میں اصل کے ہم پلہ ہیں البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ترجمانی کا پورا حق ادا کر سکتے ہیں اور ریاض قدیر کو بلند پایہ مترجم ثابت کرتے ہیں''۔ ص:۱۱

موپساں کے افسانوں کے موضوعات عام ہیں لیکن بہ اعتبار دلکشی اس کا اندازِ بیاں خاص ہے ایسا خاص کہ موپساں کا ''افسانہ'' خود کو اپنے قاری سے پڑھواتا ہے اور قاری اس کے افسانے کو ہاتھ کر ختم کیے بغیر چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا''۔ ص:۱۱

موپساں کے افسانوں میں سے ہمیں منٹو کے افسانوں کی خوشبو آتی ہے۔ ان کے افسانے اردو کے افسانہ نگار منٹو کے افسانوں سے قریب تر ہیں۔ منٹو بھی معاشرے میں بکھری حساس کہانیوں کو افسانوں کے رنگ میں بیان کرتا ہے یہی انداز موپساں کے ہاں ملتا ہے۔

بقول ڈاکٹر انوار احمد:

''منٹو کے شعور کی بالیدگی میں موپساں کی تلاش اردو ادب کی خدمت ہوگی اور موپساں کے تراجم میں سے منٹو کی نئی جہات سامنے آئیں گی''۔ ص:۱۰

موپساں کے افسانوں کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ''خواب گاہ'' کی بدولت ہر جگہ ہمیں ریاض قدیر کی محنت اور کاوش کو داد دینا پڑتی ہے جنھوں نے ایک اجنبی کی زبان میں بیان کردہ مفہوم کو اس انداز میں اردو زبان کا رنگ دیا ہے کہ ہم موپساں کے خیالات اور اندازِ تحریر سے آسانی کے ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ موپساں اپنے اردگرد سے کہانیاں تلاش کر کے انھیں تحریر کے ذریعے اَمر کر دیتا ہے۔ وہ اس خوبصورتی سے اصل مفہوم کو واضح کرتا ہے کہ پڑھنے والے میں تجسس و شوق دونوں بیک وقت جنم لیتے ہیں''خواب گاہ'' میں موپساں کے بیس افسانے ترجمہ کیے گئے ہیں۔

''خواب گاہ'' کا پہلا افسانہ بھوک ہے اس افسانے میں ٹرین کے سفر کا منظر دکھایا گیا ہے۔ ایک عورت مسافر ہے جو روزگار کے لیے اپنی شیرخوار بچی کو چھوڑ کر گھر سے نکلتی ہے اور دوسرا مسافر ایک دبلا پتلا بیس سالہ نوجوان ہے جس کے چہرے پر بے روزگاری کی زردی چھائی ہوئی ہے۔ اس مرد کے ہاں غربت اور بے بسی کی انتہا ملتی ہے۔ اس افسانے میں موپساں نے غربت کی انتہا کی ایک الم ناک تصویر کھینچی ہے۔ معاشرے کا ایک اہم عنصر روح کو ساکت کر دینے والی کہانی کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ بیس سالہ نوجوان کی غربت اور بے بسی کی تصویر بھوک سے اُس کی للچائی ہوئی نظریں اور فاقے اسے کس انتہا تک پہنچا دیتے ہیں بقول مصنف:

''لڑکے نے سر اٹھا کر اسے کھاتے ہوئے دیکھا تو اس کی مدھم نگاہ اس عورت کی گود سے اس کے منہ تک ہر لقمے کا تعاقب کرنے لگی...... اس سے پہلے سے پژمردہ چہرہ اور بھی مرجھا گیا وہ حسرت سے اسے دیکھ رہا تھا''۔ ص:۱۵

اس افسانے میں موپساں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پیٹ کی بھوک نفس کی بھوک سے بھی زیادہ

اذیت ناک ہوتی ہے جو انسان کو حواس باختہ کر دیتی ہے۔ بھوک انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ختم کر دیتی ہے۔ انسان کو ہر جائز اور ناجائز کام کرنے پر اُکساتی ہے۔ بھوکا انسان اچھے برے کی پہچان سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں تمام انسان اپنے پیٹ کی بھوک مٹانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس بھوک ہی کی بنا پر معاشرے میں برائیاں جنم لیتی ہیں۔ اس افسانے میں تشبیہات اور استعارات کی بھی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔

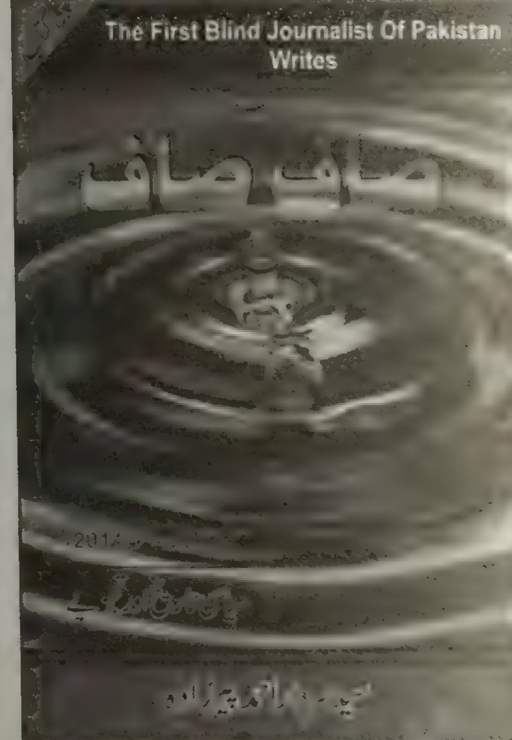
''یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سمندر اور پہاڑ کے درمیان کوئی
لوہے کا سانپ برق رفتاری سے بھاگ رہا ہوگا''ص:۱۷

بیس افسانوں پر مشتمل کتاب میں مصنف نے مختلف کرداروں کے ذریعے معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ کتاب مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد نے شائع کی ہے۔

مبصر: صبا بتول رندھاوا

صاف صاف از سید سردار احمد پیرزادہ

''تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں انسانوں کے لیے



آنے والی سب تبدیلیوں میں تحریر اور کتاب کا بہت اہم کردار ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ گزشتہ ۶۴ برسوں میں ہمارے ہاں بے پناہ لکھا گیا لیکن کوئی بڑی اور دیرپا تبدیلی رونما نہ ہوئی اس کی وجہ سوچنا ضروری ہے''۔ یہ فکر انگیز جملے ''صاف صاف'' کے پیش لفظ کی ابتدا ہے۔ جو اس کے لکھنے والے کی بصیرت افروزی اور نوع انسانی کی سوچ میں تبدیلی کا پیش خیمہ ہیں۔ ''صاف صاف'' سید سردار احمد پیرزادہ کا ۳۲۸ صفحات پر مشتمل پچانوے کالموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں پہلے چار کالم اللہ، اللہ کے رسول اور اس کی مخلوق سے عقیدت پر ہیں۔ جس میں ''کرم کے موتی'' گویا تمام انسانی زندگی پر محیط ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا کے مصداق طاعت نفس سکھاتا ہے۔ اسی طرح ''کیا آپ مصروف ہیں؟'' آج کی مادی دنیا اور اس کی لذتیں، انسان کی اپنے خالق سے، مذہب سے دوری کو یوں بیان کیا ہے کہ صرف ایک یہی کالم برسوں کی تبلیغ پر حاوی ہے۔ ''صاف صاف'' کے اکیانوے کالموں کا دورانیہ ستمبر ۲۰۰۷ء سے اکتوبر ۲۰۱۱ء تک محیط ہے۔ یہ تمام کالم اسلام آباد، کراچی اور لاہور کے نوائے وقت میں چھپ چکے ہیں اور عوامی شعور کو بیدار کرنے میں خاطر خواہ خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ ''صاف صاف'' کے تمام کالم اپنے عنوانات سے ہی قاری کی توجہ مبذول کرانے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر کالم کا چونکا دینے والا آغاز اور ذہنی شعور کو بیدار کرنے والا اختتام قاری کو مثبت روی کی جانب گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سیاسی باریکیوں پر اتنی گہری نظر، ملکی اور غیر ملکی تاریخ کا وسیع مطالعہ، حقیقی تجزیہ نگاری، ٹھوس شواہد کے ساتھ، سیاسی افق کے سورج کا طلوع و غروب، اہم حقائق، اقتدار کی ہوس، عہدوں کی ناقدری، سیاسی غلط فہمیاں، حکمرانوں کی عیاریاں، ذاتی مفادات کی جنگ، غریب عوام کے ساتھ بڑھتی ہوئی ناانصافی، جمہوریت کے نام پر دھوکا، وطن اور وطنیت پر جھگڑے، انسانی حقوق کی پامالی، ماضی کا خوف، حال کی بے چینی اور مستقبل کی بڑھتی ہوئی امیدیں، عوام اور خواص کا تعصب ...... یہ سب ہمیں ''صاف صاف'' کے صفحات پر جا بجا نظر آتا ہے۔

کالم نگاری ایک منفرد صنفِ صحافت ہے کہ یہ کالم نگار کے اسلوبِ بیان، طرز نگارش، فکر انگیزی، بصیرت افروزی، الفاظ کا چناؤ، خیالات و نظریات کی یوں عکاسی کرتی ہے کہ ایک کالم نگار اپنے قاری کی نبض سے کیسے مرض کا اندازہ لگا کے بیماری کی تشخیص اور بہترین علاج تجویز کرتا ہے اور علم و ادب میں گہرا مقام رکھتے ہوئے زبان و ادب کی چاشنی سے دوسروں کے دل کو موہ لیتا ہے۔

یہ صنف الفاظ کی حرمت کی دعویدار ہے اور ''صاف صاف'' کو لکھنے والے ''سید سردار احمد پیرزادہ'' ہیں جو کہ ''پاکستانی قلمکاروں میں پہلے نابینا صحافی ہیں۔ راقم کو ان سے ملنے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ اور ایسے عظمت کے میناروں سے ملاقات گویا بہت بڑا شرف ہے اور ان سے مل کر یا ان کی کتاب پڑھ کر کہیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اس نعمت خداوندی سے محروم ہیں۔ جنہوں نے اپنی کمزوری کو اپنا عذر نہیں بنایا۔ وہ اپنی ہی کتاب میں لکھتے ہیں۔ ''جب آنسوؤں کا کوئی خریدار نہیں تو پھر انہیں کیوں مشتہر کیا جائے۔''

بات صرف فیصلہ کرنے کی ہے۔ وہ فیصلہ انہوں نے کیا اور آج نابینا ہوتے ہوئے ایک بینا سے زیادہ دیکھا، محسوس کیا اور صفحہ قرطاس پر بکھیرا اور اپنے لفظوں کے جادو سے وہ سحر پھونکا اور عدم بصارت سے بصیرت سازی کو یوں فروغ دیا کہ بائیسویں اے پی این ایس ایوارڈ کی تقریب میں صدر مملکت سے ''بہترین کالم نگاری'' کا ایوارڈ حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ۲۰۱۲ء میں ہی چولستان ایوارڈ حاصل کیا۔ اور ۲۰۱۳ء میں نظریہ پاکستان کے زیر اہتمام صحافت میں نمایاں خدمات ادا کرنے پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے سونے کا تمغہ بھی وصول کر چکے ہیں۔ آپ ایک ممتاز کالم نگار، سینئر بے باک صحافی، سب ایڈیٹر، رپورٹر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے مختلف صحافتی اداروں میں نمایاں کام کرنے والے محنتی اور فعال انسان ہیں۔ ''سید سردار احمد پیرزادہ'' نے اسلام آباد میں سفارت کاروں کے لیے خصوصی انگریزی ماہنامے ''ڈپلومیٹک'' کا اجراء کیا۔ نئی طرز کے ساتھ ایک میڈیا آرگنائزیشن کی بنیاد رکھی۔ جس کا نام Research & information service emporium(Rise24) ہے۔ مقتدرہ قومی زبان (ادارہ فروغ قومی زبان) میں اخبار اردو کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ اردو زبان کی کتابوں کے لکھنے میں معاون، اردو زبان کے فروغ میں سرگرم، ریڈیو سن رائز کے میزبان، لائیو شوز کے اینکر پرسن، یہ سب اس تنہا فرد کی داستان ہے۔ جن کے الفاظ میں حرارت، جذبہ، ولولہ، خود شناسی اور انسان سے محبت ہے۔ یہ باعث تعجب نہیں کہ ہم ان کو بصیرت سے محروم سمجھیں وہ تو سنگ میل ہیں۔ اور بہت ''صاف صاف'' سب کچھ لکھ اور پڑھ لیتے ہیں اور اس ملک کا سرمایہ ہیں۔ یہ اس رب کی کرامت ہے کہ وہ جس کو جتنا نواز دے، کسی کو بصیرت دے کر کچھ دکھائی نہیں دیتا اور کچھ عدم بصیرت سے وہ چراغ روشن کر رہے ہیں کہ ان کی لو رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ اور ان کی ذہانت و فطانت پر سبھی حیران ہیں۔ ثابت قدمی اس قدر ہے کہ گزشتہ تیئس برس سے سترویں گریڈ میں ایک ہی محکمے میں حکمرانوں کی عدم توجہی کے باوجود اتنے صبر اور قناعت سے بیٹھے ہیں کہ اسی حالت کے پیش نظر اپنی ہی کتاب میں ''صاف صاف'' درج کیا ہے۔ جو کہ ایک چینی کہاوت ہے۔ ''آہستہ آہستہ آگے بڑھنا بری بات نہیں رک جانا موت ہے۔'' جبار مرزا ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں ''سردار احمد پیرزادہ کا سفر بڑی جواں مردی اور ہمت سے جاری ہے۔ انہوں نے سفید چھڑی کو مہمیز، قلم کو تلوار اور احساس کو بصارت بنا لیا ہے۔ ایسے ہمالہ صفت انسانوں کے آگے اگر بلائیں بھولے سے آ بھی جائیں تو گھبرا کے راستے سے ہٹ جایا کرتی ہیں۔''

''صاف صاف'' ایسی کتاب ہے جو ہم پر بہت سے سوچ کے در وا کرتی ہے۔ اور ہمارے بہت سے مسائل کا حل ہمارے اپنے ہی پاس موجود ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ سیاسی باریکیوں کو یوں بیان کیا ہے گویا سیاسی نباض ہوں۔ اور ملکی صورتحال کو اس دور میں ایسے محسوس کیا ہے کہ ہم جیسے دیدہ و بینا تو اس معراج کو چھونے کا بھی تصور نہیں کر سکتے اور ملکی تلخیوں کو مزاج کی چاشنی میں لپیٹ کر عوام کو آگاہی کی نئی منزل پر پہنچایا ہے۔ سب سے خوبصورت بات کہ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۱ء تک کے سیاسی نشیب و فراز کی یوں منظر کشی کی ہے کہ آج بھی

لگتا ہے ہم انھی الجھے دھاگوں کو سلجھا رہے ہیں اور کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔ بس ایک مسیحا کی تلاش ہے۔ ایک اجالا ہے جو ہمیں منزل کی طرف بلاتا ہے اور تابناک مستقبل کی نوید ''صاف صاف'' جھلکتی ہے۔ صاف صاف میں درج ہے ''پاکستان میں ۲۱ویں صدی کا سورج لوگوں کے لیے ایک نئی ترنگ لے کر آیا۔ وہ پہلے سے زیادہ انکاری ہوئے، بے باک ہوئے، بولنے لگے، چلنے لگے، مرنے لگے اور کسی حد تک سوچنے لگے''۔

کسی بھی قوم کی تبدیلی کا یہی نقطہ آغاز ہے کہ وہ سوچنے لگے اور اس طرح کے عظیم قلمکاروں کی عظیم کتابیں سوچ کو مثبت رخ عطا کرتی ہیں۔ اس بات کا اعتراف ''منو بھائی'' نے اپنے کالم گریباں میں کیا۔ جاوید چودھری نے اس کتاب اور ادیب کی عظمت کا اعتراف زیرو پوائنٹ میں کیا، فضل حسین اعوان نے اپنے کالم شفق میں کیا اور محمد آصف بھلی نے ''چوتھا ستون'' کالم لکھ کر کیا۔ یہ سب اور بہت سے احباب جو اس کتاب کی سچائی اور بے باکی اور سردار احمد پیرزادہ کی بڑائی کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کی اگلی کتاب کے منتظر ہیں۔ ایسے ہی الفاظ ایسی کتاب اور ایسے لکھنے والے قوموں کی تقدیر بدلنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ جو صلے کے تمنائی نہیں۔ صرف تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ اور خوشی اور سکون کے متلاشی ہیں۔

''صاف صاف'' پیرزادہ صاحب کی جانب سے میرے لیے خلوص کا نذرانہ تھا جسے میں نے سرمایہ سمجھ کر وصول کیا اور اس کتاب کے ہر لفظ کو محبت سے پڑھا۔ اللہ ان کے درجات بہت بلند فرمائے۔ آمین

مبصر: شازیہ مجید ملک

قیمت: -/۵۰۰ روپے
برقی پتا: www.saafsaafive.com
www.saafsaaf.blogspot.com

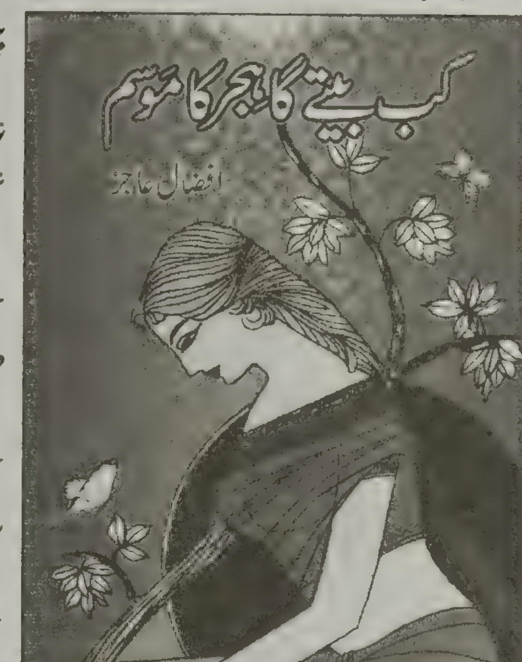
(بشکریہ: روزنامہ نوائے وقت)

کب بیتے گا ہجر کا موسم از: افضال عاجز

شاعری دراصل واردات قلبی کی سچی ترجمان اور زندگی کی صداقتوں کی صحیح تفسیر ہوتی ہے۔ شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے۔ سوئے احساس جگاتی ہے۔ مردہ جذبات کو جلا بخشتی ہے۔ حوصلوں کو بڑھاتی ہے۔ ''کب بیتے گا ہجر کا موسم'' کے شاعر افضال عاجز کا شمار دور جدید کے عظیم ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں گہرائی ہے۔ معنویت اور سوز و گداز ہے۔ مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں:

ہر کسی کی آنکھ میں دیکھا نہ کر
چلتے چلتے راہ میں ٹھہرا نہ کر
ہے اگر خواہش کہ یہ قائم رہے
دوستوں کی دوستی پرکھا نہ کر

حقیقت پسندی سے لبریز یہ شعر افضال عاجز کے ہیں۔ یوں تو ان کے مجموعے میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ناقدین کسی شعری مجموعے اور شاعری میں ڈھونڈتے ہیں اور کسی بھی لکھاری کو ایسی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنے کے ہیں۔ اگر غزل کو صرف اسی تعریف کے آئینے میں دیکھا جائے تو گزشتہ چار دہائیوں سے شعر کہنے والے افضال عاجز کی مکمل شاعری حوالے کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔



عاجز کی شاعری حسن و عشق کی شاعری ہے۔ ہر شاعر فطری طور پر حسن پرست ہوتا ہے اور فطرت کے ہر شاہکار کا عاشق ہوتا ہے اور فطرت کے شاہکاروں سے محبت کا جذبہ ہی اسے شعر کہنے پر اکساتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے شعری مجموعے ''کب بیتے گا ہجر کا موسم'' میں لکھتے ہیں کہ

آنکھوں کے جزیروں پر اترنے نہیں دیتا
وہ شخص کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتا
چلتا ہے سمٹ کر وہ بہت تیز ہوا میں
آنچل کا کوئی رنگ بکھرنے نہیں دیتا

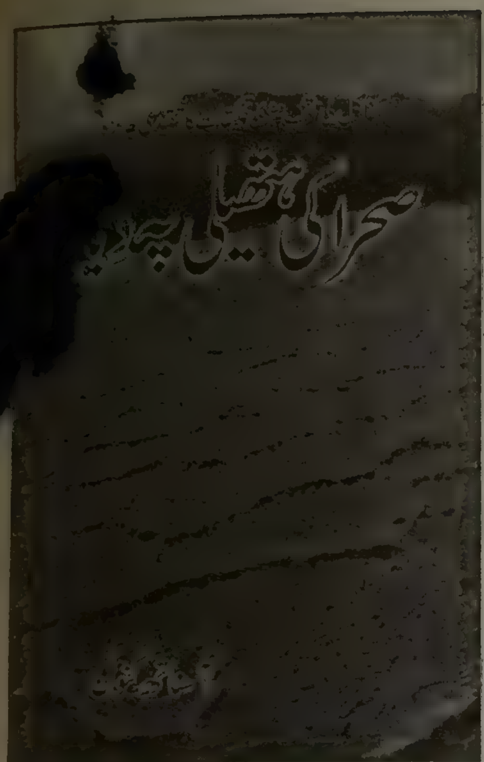
عاجز کی شاعری میں موزونیت پوری طرح موجود ہے۔ ان کی شاعری میں موزوں الفاظ اور عمدہ تراکیب کا استعمال ہے محض الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں ہے۔ عاجز نے غزل کو نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شاعری میں انھوں نے بطور نمونہ آئیڈیل کسی شاعر کو سامنے نہیں رکھا۔ اپنا اسلوب قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ عاجز کی کاوش یقیناً قابل داد ہے۔

مبصر: منزہ مبین

پبلشر: پرائم ٹائم پبلی کیشنز، واہ کینٹ

صحرا کی ہتھیلی پہ دیا از: آسناتھ کنول

''صحرا کی ہتھیلی پہ دیا'' (آغا گل کی منتخب نثری تخلیقات کا تنقیدی جائزہ) آسناتھ کنول کی تنقیدی کتاب ہے۔ آسناتھ ہمہ جہت شخصیت کی مالک خاتون ہیں۔ وہ نہ صرف منجھی ہوئی شاعر، افسانہ نگار، کالم نگار ہیں بلکہ بحیثیت محقق و نقاد بھی اپنے



فن کا لوہا منوا چکی ہیں۔ اردو ادب میں خواتین کی بہترین کاوشیں شاعری، افسانہ و ناول نگاری، سوانح عمریوں، آپ بیتیوں میں تو کثرت سے نظر آتی ہیں لیکن تحقیق و تنقید کے میدان میں شاذ و نادر بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بطور محقق و نقاد جن خواتین نے اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں ان میں ممتاز شیریں، حجاب امتیاز علی تاج وغیرہ شامل ہیں۔ آسناتھ کنول اپنی بہترین کاوش کے بل بوتے پر اپنا نام ان کی صف میں شامل کر چکی ہیں۔

''صحرا کی ہتھیلی پہ دیا'' آغا گل کے فن پر تحقیقی و تجرباتی کام ہے۔ آسناتھ کنول نے انتہائی جانفشانی، باریک بینی سے معروف محقق و نقاد، دانشور، افسانہ و ناول نگار آغا گل کی منتخب نثری تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے بہت مہارت سے جناب آغا گل کے فن اور شخصیت کے پوشیدہ گوشوں کی بازیافت کی ہے اور ان کے فکری و فنی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے جو ان کی ذہنی بصیرت کی عکاس ہے۔

آج کا نقاد ادبی معیار کے تعین میں اگرچہ قدماء کے بنائے ہوئے تحقیقی و تنقیدی اصولوں، تصورات، مقاصد پر اپنے مطالعے کو مرکوز رکھتا ہے لیکن ادبی معیار اور حقائق کے تعین میں تحقیقی عمل سے گزرے بغیر یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ اس لحاظ سے تنقید میں تحقیق سے استفادے و انجذاب کے اس عمل کی عمدہ مثال آسناتھ کنول کی تنقیدی کتاب ہے۔ مصنفہ نے اپنے موضوع کا احاطہ بہت عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ یہ کتاب اپنے اسلوب کے لحاظ سے نہایت سنجیدگی اور متانت کے لب و لہجہ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں کوئی جملہ فاضل نہیں، کوئی جملہ بے ربط یا نامکمل نہیں ہے۔ ''صحرا کی ہتھیلی پہ دیا'' جہاں ادبی دنیا میں ایک خوبصورت اضافہ ہے وہیں یہ تنقیدی کتاب جناب آغا گل پر جامعات میں ایم اے، ایم فل کی سطح پر تحقیقی مقالہ جات لکھنے والے طلبہ و طالبات کے لیے حوالہ کے طور پر بہترین نمونہ ہے۔ آخر میں میری طرف سے محترمہ آسناتھ کنول کو بہت بہت مبارک باد۔

مبصر: منزہ مبین

ہاتھوں پر لکھی کہانیاں از: شاہد زبیر

''الوہی داخلی آواز اس کی رہنمائی کرتی ہے اور اس کا ضمیر اسے بتاتا رہتا ہے کہ صحیح کیا ہے.....'' شاید کسی نے یہ ہمدم دیرینہ شاہد زبیر کے بارے میں کہا ہے اور سچ کہا ہے اور یہ

ت بھی نہایت اہم ہے کہ انسان کا کوئی اپنا نقطہ نظر بھی ہو''......



واقعی تعجب ہوتا ہے! م نے دوسروں سے کچھ نہیں لیا، جو کچھ لکھا ہے خود لکھا ہے''...... اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ''مجھے امید ہے کہ اسے پڑھ کر آپ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے''۔

اور یہ شاہد زبیر ہی کی کہانیاں ہیں جو بالآخر قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ فکری تاحیذ کو اپنے نقطہ نظر سے ہم آہنگ کر کے ایک نئے نقطہ نظر تک کا سفر اور پھر قاری کو عجیب سی سرشاری میں مبتلا کر دینا شاہد کی کہانیوں کا خاصا بھی ہے اور ندرت بھی۔ کہیں کہہ مکرنی کی کیفیت ہے تو کہیں حیرت سے زبان کے گنگ ہونے کی کیفیت ہے کہیں نتیجہ پہلی ہی سطر میں ہے تو کہیں اساطیری کیفیت نتیجے کو صدیوں پر، صدیوں تک مؤخر کر دیتی ہے۔ کہیں مصنف نتیجے سے بے نیاز ہے تو کہیں قاری پر نتیجے سے استغنا بلکہ برات کی کیفیت ہے، کہیں قیل وقال ہے تو کہیں حال کی کیفیت ہے، فلسفیانہ موشگافیوں سے ایقان تک کا سفر، بلکہ سفر درسفر ہے۔ جسے ماضی کے دھندلکوں سے حال کی تلخ نوائی تک صدیوں کے ارتقاء کا سامنا ہے۔ موضوع کو پھیلانا اپنی جگہ ایک فن ہے لیکن اس موضوع سے بہت کچھ حذف کر دینے کے بعد بھی سلسلہ تکلم میں خلا کے باوجود تفہیم کو متاثر نہ ہونے دینا ایک فن ہے اور یہ ہنر شاہد زبیر کو آتا ہے۔

''ہاتھوں پر لکھی کہانیاں'' شامت خود ساختہ سے حالات کے جبر تک پھیلے زندگی کے ایک لامتناہی سلسلے کی کہانیاں ہیں جنھیں شاہد زبیر نے حیات گم گشتہ کے مدفن سے نکال کر حیات عصری پر منطبق کر دیا ہے ''رشتے'' کی طوطا کہانی مین دوطرفہ شدید احساس محبت کا اظہار ہو، ''سانس کا پہرہ'' کا آفاقی احساس امید ہو، ''وعدہ'' میں وعدہ خلافی کی نفاست سے کی گئی تلافی ہو۔ ہر کہانی میں تفہیم اور تفہیم در تفہیم کی نئی دنیا آباد ہے، بعض کہانیوں میں تفہیم کی کئی پرتیں ہیں جن تک رسائی کے لیے قاری آزاد ہے کہ وہ کوئی بھی نتیجہ اخذ کرے، اس میں مستقبلیت (Furturing) کی گنجائش موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کہانیاں قاری کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ انھیں بار بار پڑھے اور ہر بار اس کی ندرت آگین معنویت سے آشنا ہو، زندگی کا کرب کہیں زیرلب مسکراہٹ میں مدغم ہے تو کہیں تفکر عصری حسیت کی تلخیوں سے آہنگ ہے، یقین نہ آئے تو ''ڈپلومیسی'' پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ ''پیاس کی خودکشی'' میں بھی مفہوم کی ایسی کیفیت کا عکس ہے مگر تفہیم مکمل طور پر مختلف ہے۔

یادش بخیر! ''علامتیت'' شاہد زبیر کے ہاں ایک مکمل تفہیم کے طور پر موجود ہے اور انھوں نے جس مہارت سے علامت کو برتا ہے وہ بلاشبہ جدید افسانے کے لیے آفاق کی نشاندہی کر رہی ہے۔

شاہد زبیر کی کہانیوں میں انفرادی المیے سے لے کر سماجی عفریت بلکہ حسی عفریت تک موضوعات کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ نزاکتوں سے سماجی تلخیوں تک رنگ وآہنگ کی ایک معنی خیز دنیا آباد ہے جو بعض اوقات پرائی ہوتے ہوئے بھی اپنی ہے اور یہی شاہد زبیر کی کہانیوں کی خاصیت ہے جو قاری کو سحر میں مبتلا رکھتی ہے۔

امید ہے ''ہاتھوں پہ لکھی کہانیاں'' ہاتھوں کی لکیروں کی مانند خوش کن مستقبل کی نشاندہی کریں گی، جس پر علم وادب کی دنیا کو ناز ہوگا۔

مبصر: ڈاکٹر شاہد حسن رضوی

ناشر: دستک پبلی کیشنز، گول باغ، گلگشت، ملتان

برقی پتا: dastakpublication@yahoo.com

رسائل پر تبصرہ

مبصر: تجمل شاہ

ماہنامہ ادب لطیف، لاہور

پیش نظر ماہنامے ''ادب لطیف'' میں ممتاز شیریں اور میرا جی کے حوالے سے مضامین کو جگہ دی گئی ہے جبکہ افسانے، انشائیے، یادرفتگاں، تبصرے اور آراء بھی شامل اشاعت ہیں۔ اس رسالے کے بانی برکت علی چوہدری ہیں، مدیر اعلیٰ صدیقہ بیگم، مجلس ادارت میں شاہد بخاری، افتخار علی چوہدری، ظفر علی چوہدری، محمد خالد چوہدری، محمد اکبر چوہدری جبکہ ناشر آفتاب احمد چوہدری ہیں۔ تاہم ماہ اور سن اشاعت کا ذکر نہیں۔

پتا: ۳۹ گرین ایکرز، رائے ونڈ روڈ، لاہور

برقی پتا: adabelatif@hotmail.com

سہ ماہی نُصرۃ الاسلام، گلگت

پاکستان کے شمالی علاقہ جات جیسے دور افتادہ علاقے سے نکالا جانے والا یہ رسالہ یقیناً لائق تحسین ہے۔ حضرت مولانا قاضی عبدالرزاق کی یاد میں نکالا جاتا ہے۔ جنوری تا جون ۲۰۱۳ء کے شمارے کا آغاز اداریہ ''آوازِ حق'' سے کیا گیا ہے۔ جس میں مدیر اعلیٰ کا اس مجلّے کے حوالے سے مؤقف موجود ہے جبکہ مکالمات و ڈائیلاگ، سیرت صحابہؓ، سفرنامہ، کشمیریات، سوانح عمری، پیغامات حزن، مقالات مضامین، کالم کارنر، مسائل و فضائل جیسے اہم موضوعات کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ تبصرہ کتب، اخباری سرگرمیوں اور مراسلات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ ۱۴۶ صفحات پر مشتمل اس شمارے کا پتا درج ذیل ہے: جامعہ نصرۃ الاسلام، عید گاہ روڈ، گلگت بلتستان۔

برقی پتا: ibshaqqani@gmail.com

ماہنامہ نفاذ اردو، کراچی

تحریک نفاذ اردو کو اجاگر کرنے کے لیے ڈاکٹر سید مبین اختر نے اپنی مدد آپ کے جذبے کے تحت اس رسالے کی اشاعت کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے جس میں اردو کے نفاذ اور اس حوالے سے تحقیقی مضامین اور تقریبات کی خبروں اور تصاویر کو نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ یہ رسالہ گزشتہ تین سالوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے جس سے ڈاکٹر صاحب کی اردو سے محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس رسالے کے مدیر شبیر احمد انصاری ہیں۔

پتا: بی۔۱۴/۱، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی۔

برقی پتا: tnupk@yahoo.com

ماہنامہ سب رس، حیدر آباد

ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد، بھارت سے گزشتہ ۷۵ سال سے شائع ہونے والے اس رسالے میں زیادہ تر علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ پیش نظر مئی ۲۰۱۳ء کے شمارے میں قتیل شفائی کی آپ بیتی ''گھنگرو ٹوٹ گئے'' اردو کے معروف شاعر فیض احمد فیض سے متعلق حسین الحق کا مضمون ''فیض تک پہنچنے کی ایک کوشش''، ناول سے متعلق علی احمد فاطمی، ''تضاد و تصادم کی داستان''، ایوانوں کے خوابیدہ چراغ اور ابتدائی سترھویں صدی کے دکنی ادب میں سماجی نقوش سے متعلق حبیب نثار کے مضامین کے علاوہ منٹو کی خاکہ نگاری کے حوالے سے ماجد قاضی کا مضمون اور دیگر موضوعات پر تحریریں شامل اشاعت ہیں۔ رسالے کے مدیر پروفیسر بیگ احساس جبکہ مجلس مشاورت میں گوپی چند نارنگ، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر اشرف رفیع اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ہیں۔ پتا: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد ۵۰۰۰۸۲، حیدر آباد بھارت۔

برقی پتا: idarasabras@yahoo.com

سہ ماہی نظریات، لاہور

رسالے کے ''نظرات'' میں مدیر طاہر اسلام

عسکری تحریر کرتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں جو اصحاب علم و ہنر اسلام کے حکیمانہ مزاج کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں اور یہ خواہش رکھتے ہیں کہ عصر حاضر کے فہیم لوگ ان کی جانب متوجہ ہوں تو انھیں بہ ہر آئینہ اردو زبان و ادب سے رشتہ استوار کرنا ہوگا، اس سے نہ صرف یہ کہ اپنے خیالات دل آویز اسلوب نگارش میں دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ پیدا ہوگا، اربابِ ذوق کی تسکینِ خاطر کا سامان ہوگا، شعر و ادب اور علم و فن کے اس عظیم الشان سرمائے سے آگاہی حاصل ہوگی جو ہمارے بزرگوں نے دنیا کو دیا ہے بلکہ ادب کے پردے میں اخلاق انارکی پھیلانے والے نام نہاد ادیبوں کو پہچاننے میں بھی مدد ملے گی۔ ادارہ بحث و تحقیق لاہور کی جانب سے شائع ہونے والا یہ مجلّہ زیادہ تر مذہبی تحریروں پر مشتمل ہے۔ تاہم ادبی و علمی اور تحقیقی حوالے سے مضامین بھی شامل اشاعت ہیں تاہم ایک حصہ ادبیات کے لیے بھی مختص ہے۔ پیش نظر جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء کے شمارے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ''تہذیب جدید کا فکری بحران، اردو ادب کے آئینے میں'' ایک جامع تحقیقی مضمون ہے، جس میں فاضل مصنف نے ادب میں ترقی پسندی کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

۱۹۳۵ء میں حقیقت نگاری کے نام پر اردو ادب میں عریانی اور بے حیائی کا آغاز ہوا اور اس کا نام ترقی پسند ادب رکھا گیا۔ اس تحریک کی ابتدا سجاد ظہیر، احمد علی اور ڈاکٹر رشید جہاں نے کی اور ''انگارے'' کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں دین اور اخلاق پر حملے کیے گئے اور اشتراکی نظریات کی تبلیغ کی گئی۔ پھر ۱۹۳۶ء میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد پڑی اور اس کے اراکین نے اس مقصد کے پیش نظر اور حقیقت نگاری کا لبادہ اوڑھ کر دین، اخلاق، تہذیب اور ان کی اقدار کو لغو قرار دیا بلکہ محض جہالت اور اوہام پرستی کہا۔ مادہ کو اصل کہا، روح اور خدا کا انکار کیا اور اس نظریے کی اس طرح تاویل کی کہ مادی ارتقا میں احساس، شعور، عقل اور ضمیر کی تخلیق ہوتی ہے اور دین محض فریب تخیل ہے اور استحصالی طبقوں کا آلۂ کار ہے۔ اسی کے ساتھ جب فرائڈ کے نظریات بھی شامل ہو گئے تو اب نفسیاتی ماحول اور سماجی تربیت کا مرکز روٹی کی بجائے جنسیت قرار پایا۔ اس نظریے نے ترقی پسند ادب میں داخل ہو کر بے حیائی اور گندگی کو عام کیا۔ جوش، ن م راشد، میرا جی، مجاز، جان نثار اختر، جذبی، ساحر، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، احمد فراز، علی سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی وغیرہ نے ترقی پسندی میں بڑے جوہر دکھائے ہیں لیکن ان سب میں فیض سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ انھیں اشتراکیت سے وفاداری کی بنا پر روس کی طرف سے ''لینن'' کا امن انعام دیا گیا لیکن انھیں شاید اپنے محسن ملک کی پابندی یاد نہیں رہی، جہاں کوئی شخص اس حکومت کے خلاف زبان بھی نہیں ہلا سکتا تھا اور جہاں ذرا سے شک پر گولی سے اڑا دیا جاتا۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول ''آگ کا دریا'' میں اسلام اور پاکستان کے خلاف متنازعہ باتیں لکھیں۔ پیش نظر مجلّے کے نگران حافظ عبدالرحمٰن مدنی جبکہ مدیر منتظم حافظ فہد اللہ مراد ہیں۔ رابطے کے لیے پتا: ادارہ بحث و تحقیق، گلی نمبر۱، سلمان پارک، بینک سٹاپ، ۷ کلومیٹر، فیروز پورہ روڈ، لاہور۔

برقی پتا۔ tahiraskari@yahoo.com

ماہنامہ حکمتِ بالغہ، جھنگ

جدید تعلیم یافتہ لوگوں تک علوم قرآنی کو پہنچانا اور فروغ دینا اس رسالے کا نقطۂ نظر ہے۔ قرآن اکیڈمی جھنگ کے زیر اہتمام شائع ہونے والے پیش نظر مئی ۲۰۱۳ء کا اداریہ ''پاکستان کی بقا اور دو قومی نظریہ کے فروغ'' کے حوالے سے ہے۔ مضامین میں ''قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات''، ''بارگاہ نبویؐ میں چند لمحات''، ''اسلام اور سائنس اور نظریاتی تعلیم'' جیسے تحقیقی مضامین کو جگہ دی گئی ہے جس میں مضمون نگار نے نظریاتی تعلیم کے شدید فقدان پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ رسالے کے مدیر مسئول انجینئر مختار فاروقی جبکہ مدیر معاون مفتی عطا الرحمان ہیں۔ رابطے کے لیے پتا: لالہ زار کالونی نمبر۲، ٹوبہ روڈ، جھنگ صدر۔

برقی پتا: hikmatbaalgaha@yahoo.com

خبر و نظر، اسلام آباد

اردو زبان میں یہ رسالہ امریکی سفارتخانے کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ پیش نظر مارچ۔ اپریل ۲۰۱۳ء کے مشترکہ شمارے میں امریکی سفیر رچرڈ اولسن سے ملاقات، ایک پاکستانی طالب علم سے امریکی نائب صدر کا مصافحہ اور تفصیل۔ ایک حقیقی پاکستانی پیش رو فاطمہ نور کے حوالے سے رپورٹ، پاکستان اور امریکہ میں شادی کے شادیانے، شادی بیاہ کی رسم و رواج اور روایات، امریکہ میں دوہری ثقافتوں کے بارے رپورٹ اور خوابوں کی سرزمین کیلی فورنیا کے بارے مضمون شامل اشاعت ہیں۔ گوشۂ مدیر میں رائن ہیریس کہتی ہیں کہ امریکہ میں ہم روایات کو اپنے اس ماضی کا ایک اہم حصہ سمجھتے ہیں جس پر ہم اپنی روزمرہ زندگی میں فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ امریکہ کی اپنی مخصوص روایات ہیں، ان میں سے کئی ایسی ہیں جو آپ کی توقعات کے برعکس پاکستان کی روایات سے اتنی مختلف نہیں، آپ کو اس بات پر حیرت ہوگی کہ کئی طرح سے امریکہ کی ثقافتی روایات کو متوازی پاکستانی روایات بھی مل جاتی ہیں، لیکن اگر زیادہ قریب سے دیکھا جائے تو پاکستانی شادی کے ر… رواج امریکی شادی بیاہ سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ رسالے کے لیے برقی پتا: infoisb@state.gov

پاک جمہوریت

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اس رسالے کے منتظم اعلیٰ راؤ تحسین علی خان، نگران اعلیٰ محمد نعیم جبکہ ادارتی بورڈ میں سید عاصم حسنین، شگفتہ انصاری، غزالہ عنبرین، شہزاد انور اور محمد نعیم شامل ہیں۔ پیش نظر شمارے میں ''علامہ اقبال اور ملت اسلامیہ کی فلاح'' والدین کا مقام اور بدلتی ہوئی سماجی اقدار اور دیگر مضامین شامل ہیں۔ پتا: ۴۶، ایک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔

ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک

یہ رسالہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی ترجمان ہے۔ جو ادارے کے بانی مولانا عبدالحق کی یاد میں ہر ماہ گزشتہ اڑتالیس سال سے مسلسل شائع کیا جا رہا ہے۔ پیش نظر اپریل ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق سے گفتگو بھی شامل ہے۔ جس کے شریک گفتگو ڈاکٹر ممتاز احمد ہیں۔ اس ملاقات میں مولانا صاحب نے دینی مدارس کے نصاب تعلیم، دینی مدارس کی تعلیم کا مقصد درس نظامی میں قرآن و حدیث کا مطالعہ، طریق تعلیم اور دور جدید کے مسائل، سکولوں کالجوں میں دینی تعلیم کے بارے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کئی علمی مضامین بھی شمارے کی زینت ہیں۔ اس رسالے کے نگران مولانا انوار الحق ہیں جبکہ مدیر اعلیٰ مولانا سمیع الحق اور مدیر حافظ راشد الحق سمیع حقانی ہیں۔ پتا: دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، ضلع نوشہرہ۔

برقی پتا: editor_ihag@yahoo.com

ماہنامہ پیام، اسلام آباد

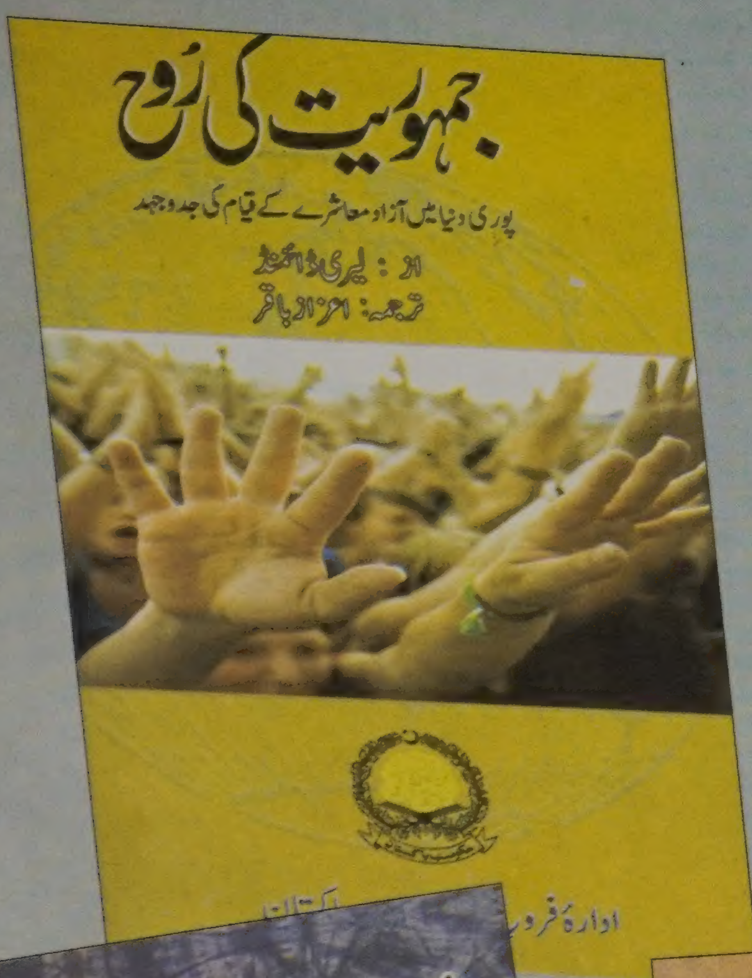
البصیرہ پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہونے والا یہ شمارہ گزشتہ سولہ برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے میں علمی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ تبصرہ کتب بھی شامل اشاعت ہوتے ہیں۔ اس کے مدیر اعلیٰ ثاقب اکبر، مدیر خواجہ شجاع عباس، مدیر مشترک، ہما مرتضیٰ اور مدیر معاون عباس تقویٰ ہیں۔

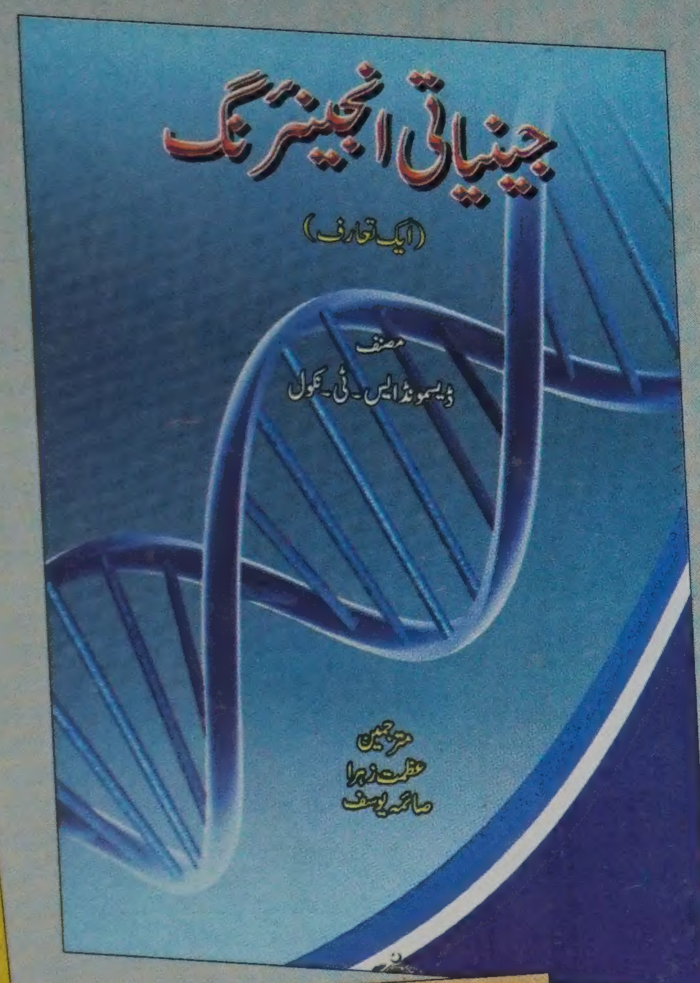
پتا: البصیرہ: ۴۰ بیلا روڈ، جی ٹن ون، اسلام آباد

برقی پتا ukuwat@gmail.com

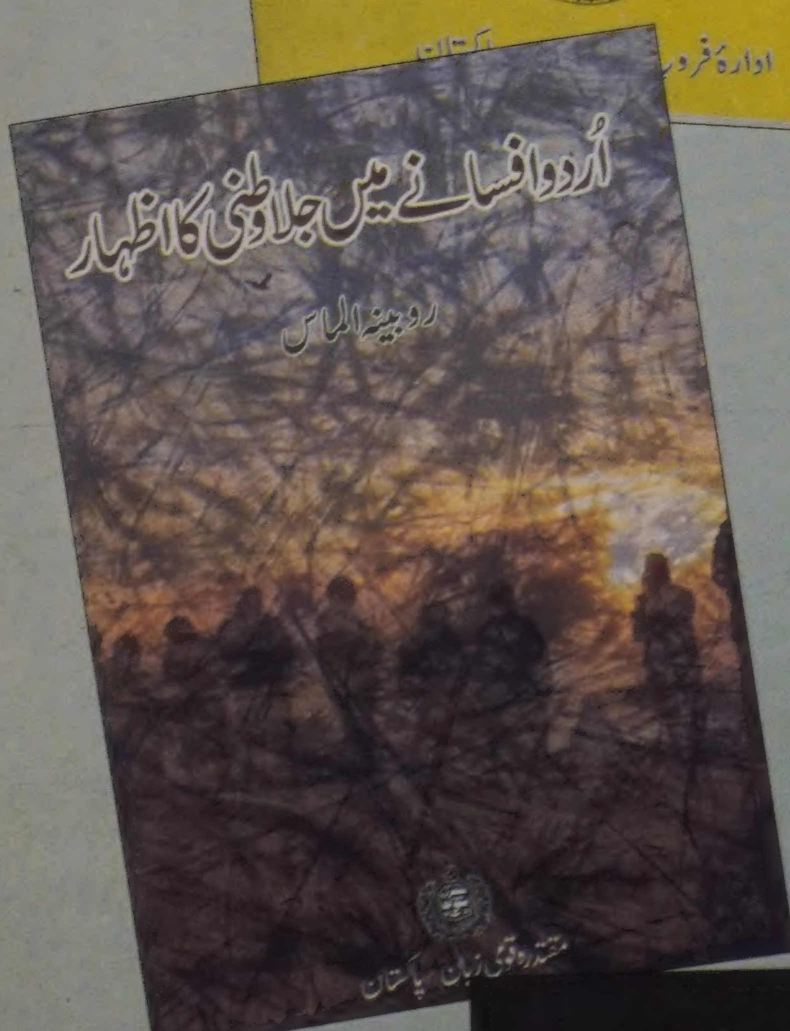
☆☆☆☆

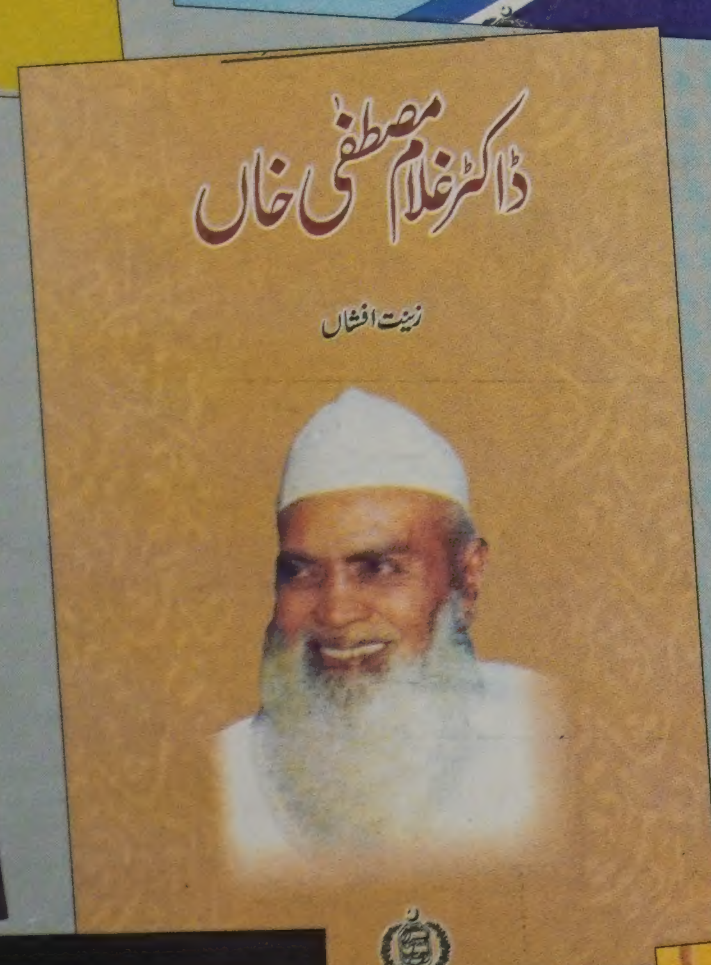
مطبوعاتِ ادارہ فروغِ قومی زبان

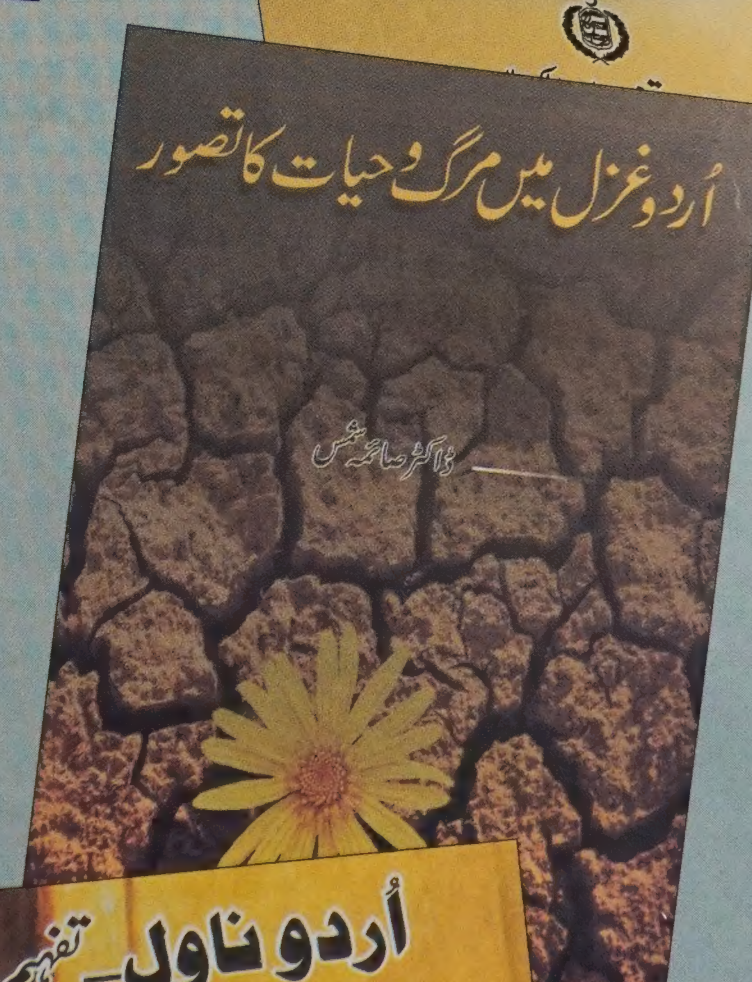


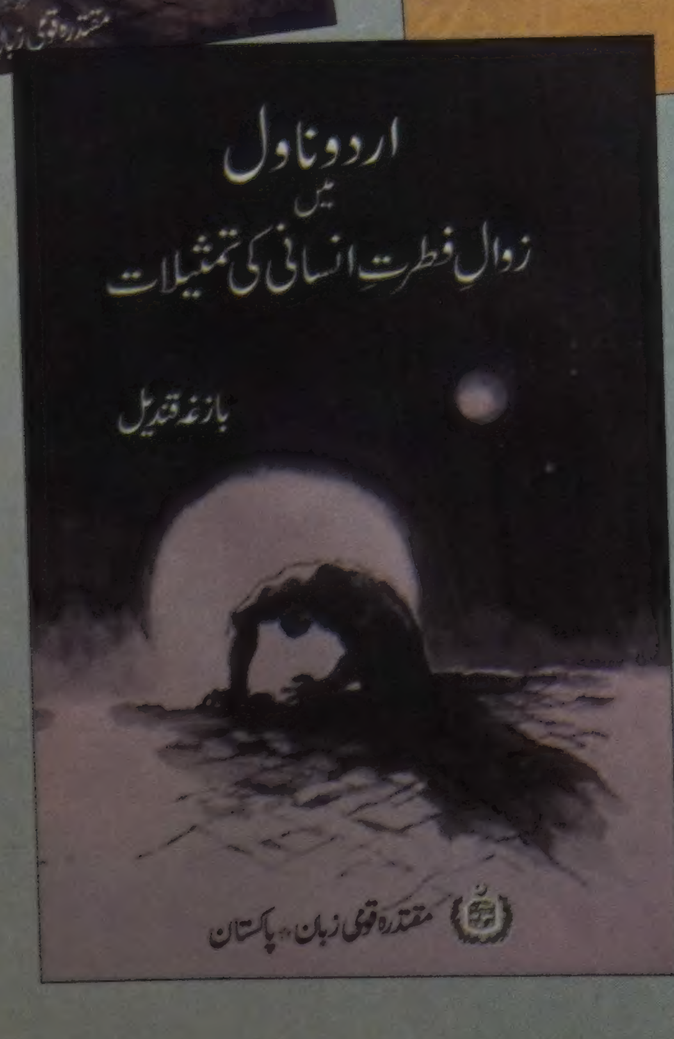


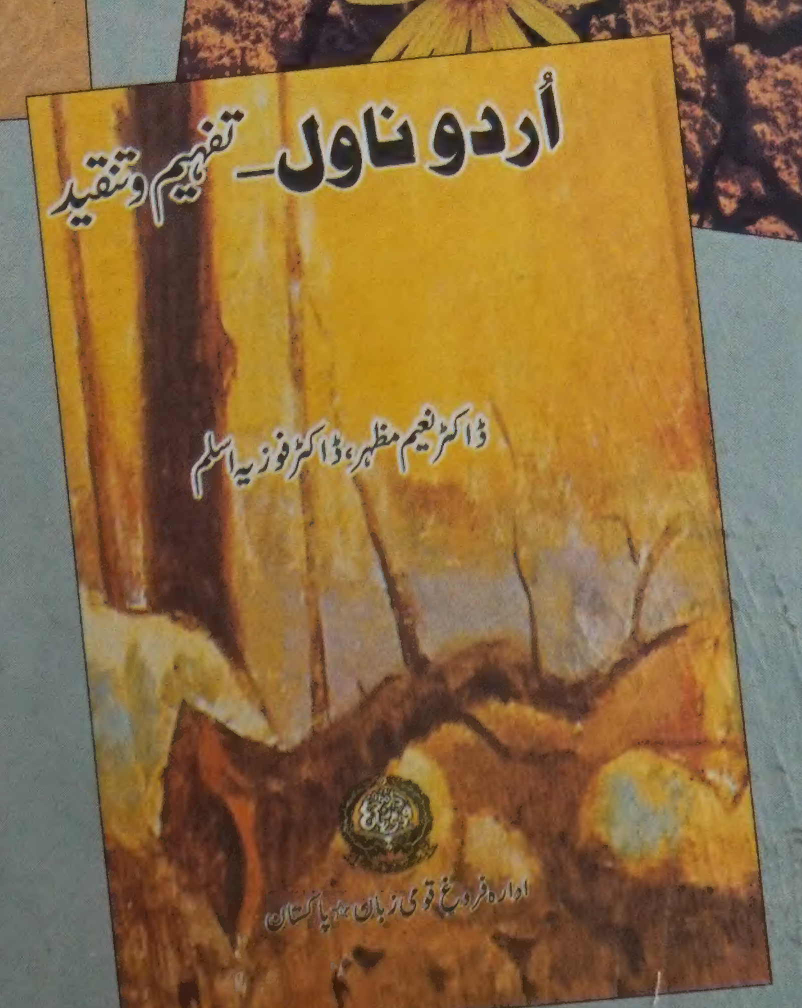












رجسٹریشن نمبر: آئی۔ ڈی ۳۷

سلسلۂ مشاہیرِ اردو



حفیظ جالندھری

۱۹۰۰ء.....۱۹۸۲ء

ابوالاثر حفیظ جالندھری صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے ادبی و شعری منظرنامے پر کم از کم نصف صدی تک چھائے رہے۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی تھی شعری ذوق رکھنے والوں کی زبان پر حفیظ کا نام تھا اور علم و ادب سے وابستہ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں حفیظ کا کلام موجود نہ ہو۔ ایک غیر معروف نوجوان شاعر جو ۱۹۲۲ء میں بائیس سال کی عمر میں جالندھر سے بے سروسامانی کے عالم میں لاہور پہنچا تھا صرف دو سال کے قلیل عرصے میں لاہور کی ادبی فضا پر چھا گیا۔ پطرس بخاری نے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ مدت سے لاہور کے شاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے، جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں، لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں''۔

حفیظ جالندھری کو شعر و ادب سے فطری اور پیدائشی لگاؤ تھا۔ وہ اُردو کے عہد ساز شاعر ہیں مگر ان کی شناخت جہاں شاعری قرار پائی وہاں قومی ترانے کے خالق کی حیثیت سے ان کا تشخص قومی حوالوں سے اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور جہاں وہ اپنی شاعری کے ذریعے ہر طبقے کو متاثر کرتے ہیں وہاں ''شاہنامہ اسلام'' کے ذریعے اپنے علمی امتیاز کو بھی منواتے ہیں۔ اردو گیت نگاری کے میدان میں حفیظ جالندھری کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں، بلاشبہ وہ اردو کے شعری منظرنامے پر بے حد نمایاں مقام و مرتبے کے حامل شاعر ہیں، انہوں نے بچوں کے لیے کئی نثری کتابیں بھی لکھیں۔

پاکستان کے قومی ترانے کے حوالے سے اگست ۱۹۴۹ء میں بہت لے دے کے بعد آخر حکومت پاکستان نے چھاگلہ کی بنائی ہوئی دھن جو کہ ریڈیو پاکستان نے تیار کرائی تھی کی حتمی منظوری کی اور ملک بھر کے شاعروں کو دعوت دی کہ اس دھن کے مطابق، اس وزن اور آہنگ پر اور اس کی بحر میں پاکستان کا قومی ترانہ تخلیق کریں۔ اس کے لیے دس ہزار انعام بھی مقرر ہوا۔ اس پر تقریباً کئی سو کے قریب شعرائے کرام نے طبع آزمائی کی اور قومی ترانہ کمیٹی کو ترانے لکھوا بھیجے جس پر کمیٹی نے ان کے ترانے کو بہترین قرار دیا اور اسے پاکستان کے قومی ترانے کے طور پر منتخب کر لیا۔ انہوں نے انعامی رقم لینے سے انکار کیا کہ قومی ترانے کا خالق ہونا ہی اتنا بڑا اعزاز ہے۔ ان سینکڑوں شاعروں کو جن میں ان کے احباب بھی شامل تھے اس اعزاز سے محرومی کا قلق تھا اور حفیظ کے ترانے میں طرح طرح کی خرابیاں تلاش کرنے لگے۔ اس پر حفیظ کا ردعمل ان اشعار کی صورت سامنے آیا:

عرضِ ہنر بھی وجہ شکایات ہو گئی
چھوٹا منہ تھا، مجھ سے بڑی بات ہو گئی
دیکھا جو کھا کے تیر، کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

انتخاب: تجمل شاہ

جمیل یوسف کی کتاب ''حفیظ جالندھری'' سے اقتباس
شائع کردہ ادارہ فروغ قومی زبان